اقبال اور حیدر آباد

(سنِ تالیف ۱۹۵۸ء و سنِ اشاعت ۱۹۶۱ء)

تالیف

نظر حیدر آبادی

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶ - میکلوڈ روڈ - لاہور

اشاعت اول	۱۹۶۱ء
اشاعت دوم	۱۹۸۱ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	[illegible] روپے

ناشر

ڈاکٹر محمد معز الدین

ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶-میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع

سید خالد محمود

مطبع

فالکن پرنٹنگ پریس

۳۰ - اُردو بازار لاہور

فہرس

پیش لفظ

ڈاکٹر محمود حسین خاں (سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان)

جناب نظرؔ حیدر آبادی شاعر کی حیثیت سے خاص شہرت کے مالک ہیں میں ان کے اشعار اکثر پڑھتا رہا ہوں اور ان سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں اب کی میں نے انہیں ایک نئے روپ میں دیکھا اور بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کی تصنیف، "اقبال اور حیدر آباد" کے مسودہ کا مطالعہ کیا۔

اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ ابھی بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ اقبال کے بعض پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جا چکی ہے، مگر ایسے پہلو بھی ہیں جو ابھی نقادوں اور دوسرے لکھنے والوں کی توجہ کا مرکز نہیں بن پائے ہیں۔ نظرؔ حیدر آبادی کی تصنیف ایک ایسے ہی پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا موضوع بالکل نیا ہے۔

میری ناچیز رائے میں "اقبال اور حیدر آباد" ایک نہایت مفید، دلچسپ اور اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ حیدر آباد عام شہروں کی طرح ایک شہر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا ثقافتی مرکز تھا جو نہ صرف دکن کے بسنے والوں کے لیے بلکہ جملہ مسلمانان ہند و پاک کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ حیدر آباد سے اقبال کے تعلق کو اُجاگر کر کے جناب نظرؔ حیدر آبادی نے ایک اہم ادبی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے اور اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

والدِ محترم حضرت علی اختر مرحوم و مغفور کے نام !

کہ

انہیں کی پدرانہ شفقت، توجہ اور ذہنی تربیت نے فکرِ اقبال کے بعض گوشوں تک پہنچنے کی سعی و کاوش کی سعادت بخشی !

دیباچہ

غیر منقسم ہندوستان میں حیدرآباد کو مشرقی تہذیب و تمدن کی آخری نشانی سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کے اجڑنے اور لکھنؤ کی تقدیر کے بگڑنے کے بعد مسلم شرفاء کے اکثر گھرانوں نے دکن ہی کا رخ کیا۔ ان کے ساتھ شمالی ہند کی بہت سی تہذیبی اور تمدنی خصوصیات نے بھی ہجرت کی۔ فتح مکہ تو ناممکن تھی، اسی مدینے کی خاک کو مہاجر و انصار کی موانست اور یگانگت نے رفتہ رفتہ اکسیر بنا دیا۔ اہل دکن خود ایک قدیم اور عظیم الشان تہذیب کے وارث تھے، برصغیر میں کوہ بندھیاچل اور ست پڑا کے اس طرف سطح مرتفع پر پھیلے ہوئے سارے سرسبز و شاداب علاقے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس پر مسلسل سات اٹھ سو سال تک مسلمان فرماں رواؤں کے پرچم لہرائے ہیں، حکمران خاندان بدلے لیکن زمام اقتدار ہمیشہ مسلمانوں کے دستِ انصاف پرور میں رہی۔ اسی انصاف اور عدل گستری کی برکات تھیں کہ دکن میں ہندو مسلم کے حیرتناک اتحاد نے ایک نئے معاشرہ کو جنم دیا تھا۔ اور یہ معاشرہ بغیر کسی فرمانروا کے مہابلی بنے اور کسی دینِ فطرت کا شوشہ چھوڑے ظہور میں آگیا تھا۔ قطب شاہوں کے عہد میں ایرانی علماء اور سفراء کی مسلسل آمد و رفت نے فارسی زبان کے اثرات کی بنیاد کو بہت گہرا کر دیا۔ اور اس طرح اردو شاعری اپنے

آغاز ہی میں نکھرنے سنورنے لگی تھی ۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شاعری دکنی بولی میں ہونے کے باوجود، اپنے اندر سلاست و روانی کے ان گنت شاہکار پوشیدہ رکھتی ہے ۔ اسی بنیاد پر بعد میں ولی اور سراج نے اردو شاعری کی شاندار عمارت کھڑی کر دی اور ولی نے دلی جاکر، اہلِ زبان کے اس مرکزِ اولین کو اردو کی لطافتوں سے آشنا کیا ۔ اسی لئے لکھنؤ میں اپنی زبان کے بگڑ جانے کا اندیشہ رکھنے والے میر صاحب نے زبان کے اس محسن کو اس طرح یاد کیا ہے ۔

معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا!

ولی کے ہم وطن اردو کی جنم بھومی کے باشندے تھے ۔ اسی لئے انہوں نے اپنے تہذیبی ورثے کی اپنی زندگی کی طرح حفاظت کی ۔ سارے ملک میں جب غیر ملکی عملداری مغربی طریقہ تعلیم کے ذریعہ ذہنی اُپج اور فطری جولانیوں کو طوق و سلاسل میں جکڑ رہی تھی تو اہلِ دکن اس ہنگامۂ گیر و دار سے دور امن و سکون کے ساتھ اپنی کشتِ علم کو اپنی زبان کے ذریعہ سیراب کر رہے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے صفحات نظام الملک آصف جاہ اول کے جانشینوں کی سیاسی غلطیوں سے سیاہ ہوں ۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں انہوں نے دکن اور اہلِ دکن کو اپنوں کی اعانت سے بیگانہ رکھا، وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ انہی کی وجہ سے (اتفاقاً ہی سہی) غیروں کی ثقافتی، تمدنی اور علمی چیرہ دستیوں سے بھی اہلِ دکن محفوظ رہے ۔

انگریزوں نے جس چالاکی سے اس عظیم الشان ملک پر قبضہ کیا تھا اس سے زیادہ ہوشیاری سے وہ اس ملک کی روایات کی نشانیاں ایک ایک کرکے مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور بڑی چابکدستی سے اس "کارِ خیر" کو انجام دے رہے تھے، جمہوری قبا میں

"دیوِ استبداد" نئے زمانے کی برکات کے عوض ہندوستانیوں کی تہذیب، اخلاق اور مذہبی اقدار کو نگلتا جا رہا تھا۔ پھوٹ کے پھل سے انسانیت کی شاخیں لچک رہی تھیں اور اندر ہی اندر قومیت کی جڑیں کٹ رہی تھیں اور برطانوی ہند کے نام نہاد آزاد خیال اور معصوم باشندے مطمئن تھے کہ انہیں کھلی فضا اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع حاصل ہے۔

ریاستیں نئے زمانہ کے ان "فیوض و برکات" سے ایک حد تک محروم تھیں۔ اور سیاست افرنگ نے ان ریاستوں کو اپنے داخلی معاملات میں "تقریباً" آزاد کر رکھا تھا کیونکہ سفید فام آقا خوب جانتا تھا کہ ریاستیں دراصل اس کے ایوانِ حکومت کی ستون ہیں۔ اس پالیسی سے لاتعداد چھوٹی ریاستوں کی رعایا بہت سی خوشگوار تبدیلیوں سے محروم ہوگئی، اور مطلق العنان حاکموں کے جبر و تشدد کا شکار رہی لیکن اسی لطفِ ستم آمیز نے غیر شعوری طور پر حیدرآباد کو ناقابلِ تصور فائدہ پہنچایا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

"ہندوستان میں اجنبی راج" کے مصنف مسٹر پنڈرل مون لکھتے ہیں:۔

"ہندوستانی[1] ریاستوں کی تعداد پانچ سو ساٹھ ہے۔ ہندوستان کے کل رقبہ کے نصف پر پھیلی ہوئی ہیں اور ہندوستان کی کل آبادی کی ایک چوتھائی ان میں آباد ہے۔ حیدرآباد کی ریاست اٹلی کے رقبے کے برابر ہے اس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے۔"

حیدرآباد کی اسی[2] ریاست کی جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا آئینی طور پر بھی اس کی حیثیت مسلم تھی۔ صلح نامہ ویسٹ فیلیا (WEST PHALIA) منعقدہ ۱۶۴۸ء کے مطابق

---

[1] ہندوستان میں اجنبی راج ص۹۶ [2] آزاد حیدرآباد مرتبہ مظفر بیگ ص۱۵

تمام متمدن دنیا میں اقتدار اعلیٰ رکھنے والی مملکتوں کو مساوی حیثیت اور مرتبہ کا سمجھا جاتا ہے چاہے وہ انگلستان کی طرح چاروں طرف سے کھلے سمندر سے یا سان مارینو کی طرح چاروں طرف سے اٹلی کی سرزمین سے گھری ہوئی ہوں یا سوئٹزرلینڈ اور افغانستان کی طرح سمندر سے دور مختلف ممالک سے گھری ہوئی ہوں۔ اسی طرح چاہے ان کا علاقہ یکجا ہو یا دنیا کے مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہو اور رقبہ چند میل کا ہو یا چند لاکھ کا، ان اختلافات سے ان کی باہمی قانونی مساوات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اصولِ قانون میں اقتدارِ اعلیٰ کا اقتضاء یہ سمجھا جاتا ہے کہ ملک کی بحیثیت حاکمہ کو قانون سازی اور عدل گستری کے اختیارات حاصل ہوں اور یہ اختیارات حیدرآباد کو حاصل تھے۔

جو کچھ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ہوتا اس کا چرچا ہی نہیں بلکہ اس کا اثر بھی حیدرآباد پر پڑتا...... بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ برٹش پالیسی بھی بدلتی رہتی تھی...... وہابیوں کا انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان، ہندوستان اور افغانستان کے درمیان بسنے والے قبیلوں کی شورش...... روس کا تیزی کے ساتھ وسط ایشیا میں اپنی قوت بڑھانا۔ اس کا خیوا اور بخارا کی سرحد تک آجانا..... تاریخ شاہد ہے کہ برٹش پالیسی ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات اور برٹش انڈیا میں سختی اور نرمی کی لہریں، عرصہ تک ان ہواؤں کی تابع رہی ہیں جو ہندوستان کے شمال مغرب میں چلتی تھیں

روس انگلستان کے بڑھتے ہوئے اثر اور ان چالوں سے جو انگلستان براعظم

؎ مہاراجہ کشن پرشاد از مہدی نواز جنگ صفحہ ۲۵،

یورپ میں چل رہا تھا، خائف تھا اور اس کو یہ خوف لگا ہوا تھا کہ جنگ کریمیا

کی طرح سے پھر کوئی جنگ کھڑی کرا کہ وہ روس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ اس

لئے روس اس ترکیب میں لگا ہوا تھا کہ وسط ایشیا میں اپنی قوت کو اس قدر

بڑھائے کہ وہ انگلستان کی شہنشاہیت کے لئے خطرہ بن جائے اور افغانستان

یا اس کے قریب ایک ایسا اڈہ بنائے جہاں سے وہ انگریزی چالوں کا ترکی بہ ترکی

جواب دے سکے ....

شمال مغربی سرحدات اور افغانستان کے معاملات کا اثر حیدرآباد اور دوسری

ریاستوں پر امپیریل سروس ٹروپس کی شکل میں پڑا ...... انگریزوں نے روسیوں

کے خلاف جو پالیسی اختیار کی اس کے تحت حیدرآباد کی پرانی پالیسی بالکل ہی

بدل گئی۔ اور حیدرآباد سلطنت مغلیہ کی یادگار اور اسلامی ریاست بننا شروع

ہوا اور برٹش انڈیا میں یہ احساس خانقاہوں کی امداد، تعلیم گاہوں میں چندے

فقراء اور مشائخ کے نذرانوں اور حجاج کے قافلے بھیج کر پیدا کرایا گیا۔"

آپ نے حیدرآباد کا ملی، سیاسی، تاریخی موقف اور جغرافیائی محل وقوع ملاحظہ

کیا۔ اس صورتِ حال سے اس وقت کے وزیراعظم حیدرآباد سالار جنگ اوّل نے بڑی

دانشمندی سے پورہ فائدہ اٹھایا۔ غلام ہندوستان کے ایک خطہ کو جس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ

یعنی مصر، ایران اور افغانستان کی آبادی سے بڑھ کر اور جس کا رقبہ یورپ کی ایک بڑی سلطنت

اٹلی کے برابر تھا، انہوں نے اپنی خوش تدبیری سے کم سے کم داخلی معاملات میں خود مختار

بنا دیا اور ایک تہذیبی اکائی کی شکل دے دی۔ ہندوستان بھر میں سرسید کی تحریکات

کا خیر مقدم سالار جنگ سے بڑھ کر کسی نے نہیں کیا۔ تعلیمی تحریکات کے علاوہ امورِ سلطنت

میں بھی سرسید کے مشورے ان کے شامل حال رہے۔ سرسید ہی کے ایماء پر چراغ علی،
محسن الملک اور وقار الملک حیدرآباد گئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور اپنی خداداد
صلاحیتوں سے حکومت کے معاملات میں دوررس تبدیلیاں کردیں اور طریقِ حکمرانی کو اس
معیار پر پہنچا دیا جس پر برٹش انڈیا میں رہنے والے بھی رشک کرنے لگے۔ سرکاری
زبان فارسی تھی۔ اس کی جگہ اردو کو دی گئی اور اس طرح علم و ادب کی دنیا میں بھی ایک
انقلاب آگیا۔ سیاسی، سماجی اور تعلیمی تحریکات اور تغیرات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی اصطلاحات
کی جانب بھی حیدرآباد رجوع ہوا۔ امرائے پائیگاہ نے اپنی بے شمار دولت کا صحیح صَرف اس
میں دیکھا کہ ان کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ سے بہت پہلے ایک دارالترجمہ
کا قیام عمل میں آیا اور سائنس اور ریاضی کی بہت سی نایاب کتابیں غیر زبانوں سے اردو
میں ترجمہ کرائی گئیں۔ اور ان کے اپنے ذاتی پریس میں طبع ہوئیں۔ اسی زمانے میں
اردو شاعری کی پرانی ڈگر کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ پر راہنما کی حیثیت سے بڑھنے اور
ایک نئی منزل کی نشان دہی کرنے والے مولینا حالیؔ اور مولانا شبلیؔ نے بھی دکن کا رخ کیا
مولانا حالیؔ آتے جاتے رہے لیکن مولانا شبلیؔ تو ایک طویل عرصہ کے لئے وہیں کے ہو رہے اور
ان کی بعض کتابیں وہیں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں۔ استاد داغؔ کو بھی اسی خاک کا پیوند ہونا تھا۔

تھی نہ کچھ ایسی کشش شاید وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں (اقبالؔ)

ان مشاہیر کے فیضان کے علاوہ خود حیدرآباد میں سید حسین بلگرامی (عماد الملک) ملّا
عبدالقیوم اور رفعت یار جنگ اوّل، مولوی انوار اللہ (فضیلت جنگ) وغیرہ کا وجود بھی وہاں

---

[1] داستانِ ادب حیدرآباد

کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ خصوصاً ملا عبدالقیوم کی شخصیت بہمہ وجوہ دکن کی سیاست اور ادب پر اثر انداز تھی۔ ملا صاحب سید جمال الدین افغانی کے گہرے دوستوں میں سے تھے مولانا شبلی کے ساتھ مل کر ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی شاخ بھی حیدرآباد میں قائم کی تھی۔ حجاز ریلوے کے چندے اور انڈین نیشنل کانگریس سے وابستگی کی بنا پر بڑی شہرت کے حامل تھے ان کے انتقال پر مولانا حالی اور مولانا حسرت موہانی نے جو خطوط لکھے ہیں ان[۱] سے ان کے کردار و عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

حیدرآباد کا ماحول یہ تھا، جب اس صدی کا آغاز ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان سے الگ مشرقی و مغربی تہذیب کے سنجوگ سے ایک نیا ملک منصۂ شہود پر نمودار ہو رہا ہے۔ فانی نے طنز نہیں کیا تھا حقیقتِ حال بیان کی تھی۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

حیدرآباد میں شمالی ہند سے آنیوالوں کو "ہندوستانی" اور جنوبی ہند سے آنیوالوں کو "مدراسی" کہا جاتا تھا۔ ممکن ہے فانی کے تحتِ شعور میں یہی جذبہ ہو۔ بہر حال اس جملۂ معترضہ سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اہل دکن میں برطانوی ہند سے اپنے کو الگ متصور کرنے کے جذبات کا پسِ منظر بہت وسیع ہے اس ذہنیت کی نشوونما میں سیاسی، تمدنی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور تہذیبی محرکات و عوامل کی ایک پوری تاریخ ہے۔ ان کا رہنا سہنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور بول چال میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ اسلام کے شاندار ماضی سے ان کی بے پناہ محبت، ریاست کو مغلیہ سلطنت کی یادگار سمجھنے کا دلفریب اور پرشوکت خیال، جاگیردارانہ نظام کی علم پروری، اشیاء کی ارزانی اور آسودہ حالی، حصولِ تعلیم کی آسانیاں اور ارزانیاں

۱؎ ملاحظہ ہو مجلۂ نظامیہ کا خصوصی شمارہ ۱۳۷۰ھ صفحات ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳

مادری زبان میں دنیا بھر کے علوم سے واقفیت کے ذرائع، امن و سکون کی چھاؤں میں بے کھٹکے آرام کرنے کے مواقع۔ ان سب باتوں نے دکن میں ایک ایسے ذہن کو جنم دیا تھا جو اپنے ذوقِ علم کی تسکین کے لئے کسی سطحی چیز کی طرف رجوع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب پنجاب کی سرزمین سے اقبال کی اجنبی لیکن دلوں میں اتر جانے والی آواز بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جس کا غلغلہ سارے ہندوستان میں ہو گیا۔ اہلِ دکن کے کان اس آواز کے مدتوں سے منتظر اور اس سے روحانی طور پر پہلے ہی آشنا تھے۔ اقبال جن "کھوئے ہوؤں کی جستجو" میں نکلے تھے ان کی جستجو اور ان کی آرزو اہلِ دکن کے سینوں میں ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح مدتوں سے سلگ رہی تھی۔ "جو جمیت تیمور کے گھر" سے رخصت ہو چکی تھی، اِسے اہلِ دکن نے حرزِ جاں بنا رکھا تھا۔ جو "نیا شوالا" وہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں وہاں پہلے سے عملاً موجود تھا اور اس وسیع جذبہ کی سمائی دہیں ممکن تھی۔ اگر "خاکِ وطن کا ہر ذرہ ان کو دیوتا" تھا تو رود موسیٰ کے کنارے امن و آسائش کے سائے میں زندگی بسر کرنے والے اسے اپنی روح کی آواز سمجھتے تھے۔ مختصر یہ کہ "اسرار و رموز" نے ان کی "بے خودی" کو کس طرح "خودی" میں تبدیل کیا۔ "بانگِ درا" نے کس طرح چونکا دیا۔ "بالِ جبریل" کے توسط سے کیا جلوے نظر آئے؟ "ضربِ کلیم" نے ان کی روحانی اقدار کے ساز کو کس طرح جھنجھنا دیا اور "ارمغانِ حجاز" نے کیونکر ان کے سینوں کو دھڑکنوں سے معمور کر دیا۔ اسی کی تفصیلات آپ اس کتاب کے آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔ دکن کو ایک "تہذیبی اکائی" مان کر اقبال کے متعلق اہلِ دکن کے کام کو ہم نے یہاں کسی حد تک یکجا کر دیا ہے۔ اس کوشش کو مکمل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ نشانِ راہ ہے، منزل نہیں۔

حصّہ اوّل

اقبال کے اثرات ادب میں!

اقبال اور حیدرآباد

"اقبال اور حیدرآباد"؛ آخر اقبال کا حیدرآباد سے کیا تعلق تھا اور اس میں کونسی نئی بات پیش کی جائے گی؟ واقعی یہ سوال چونکا دینے والا اور اہم ہے لیکن اس کا جواب تو یہ پوری کتاب ہے۔ یہ سوال اکثر ایسے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو یہ نہیں جانتے یا جاننے کی کوشش نہیں کرتے یا اگر جانتے ہیں تو اس حقیقت کو مانتے نہیں کہ دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد حیدرآباد اردو کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا اور مسلمانانِ ہند کا ایک تمدنی مظہر! اپنی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے حیدرآباد کے اہلِ علم نے اقبال کے پیام کو اپنی نظر سے جانچا تھا۔ مانگے تانگے کا ذہن ہوتا تو اردو اور فارسی کے ایک عظیم شاعر کے کلام کو اردو کے ایک بڑے مرکز میں رہنے والے بھی اسی طرح "پرکھنے" کی کوشش کرتے جو مٹھی بھر نقادوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے! خود اقبال بھی حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد کی اس خصوصیت سے کما حقہٗ واقف تھے۔ وہ صرف ایک عظیم شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بڑے فلسفی، زمانہ کے نبض شناس حکیم اور مستقبل شناس سیاسی مدبر بھی تھے۔ ان کی دور بین نظروں میں حیدرآباد کی تاریخی، تمدنی، جغرافیائی اور سیاسی حیثیت کی بڑی اہمیت تھی۔ حیدرآباد کے حالات سے ان کو ذاتی دلچسپی تھی، حیدرآباد کو آزاد و شاد دیکھنے کے وہ ہمیشہ آرزو مند رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حیدرآباد

کی افسانوی دولت سے مرعوب تھے اور وہاں کی ملازمت اور آسودہ حال زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اگر ان کے استاد داغ دکن جا کر فصیح الملک ہو گئے تھے تو وہ بھی ایسے ہی کسی پرشوکت خطاب کے متمنی تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی حیدر آباد سے دلچسپی ذاتی سے زیادہ صفاتی اور اسلامی اخوت پر مبنی تھی، ان کی درویشانہ زندگی میں ایسے سطحی خیالات دخل پا ہی نہیں سکتے تھے اور خود اہل حیدر آباد کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ اقبال کسی طرح دکن میں مستقل قیام کرتے۔ اور اہلِ حیدر آباد کی اس آرزو کو کسی حد تک اقبال کی تائید بھی حاصل تھی چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

"حیدری صاحب تو اقبال کو بلاتے بلاتے رہ گئے۔ یونیورسٹی کے کاغذات ان کی طرف سے کبھی کبھی آ جاتے ہیں کہ یہیں سے مشورہ لکھوں۔ ادھر سے مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحات علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ ان کے تراجم اردو پر تنقید کروں۔ گویا ان بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اور کام نہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کو معقول تنخواہیں دے کر بلایا ہے تو یہ کام بھی انہیں سے لینا چاہیئے۔ اصل میں یہی حصہ ان کے کام کا مشکل ہے۔

میرا جذبِ دل تو بوڑھا ہو گیا۔ آپ کا جذبہ تو بفضلہ ابھی جوان ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا؟[1]"

اور اقبال کے حیدر آباد کھینچ لئے جانے کی خبریں اکثر و بیشتر اڑتی رہتی تھیں۔ اسی طرح کی ایک خبر "خبر دکن" میں شائع ہوئی تھی اور جسے محمد دین فوق نے ان

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۹۱ و ص ۱۹۲

تک پہنچایا تھا، اس کے بارے میں اقبال نے فوق صاحب کو لکھا۔

"اخباروں[1] میں کچھ شائع ہوا ہے اسے میں نے پڑھا ہے مگر سب اخبار
میری نظر سے نہیں گزرتے۔ "مخبر دکن" کے لئے شکر گزار ہوں۔ مجھے اس معاملہ
کا مطلق علم نہیں نہ میں نے حیدرآباد میں کسی کو لکھا ہے، نہ وہاں سے مجھے
کسی نے تحریک کی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات محض اخباری گپ شپ ہے
حیدرآباد میں تو مجھ سے بہتر آدمی موجود ہوں گے۔"

اور ایک بار تو یہ خبر کچھ ایسے انداز میں پھیلی کہ مبارک باد کے تار بھی اڑ گئے چنانچہ
اقبال مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔

"یہاں پنجاب اور یوپی کے اخباروں میں چرچا ہوا تو دور دور سے مبارکباد
کے تار آگئے اور اضلاع پنجاب کے اہل مقدمات، جن کے مقدمات میرے
سپرد ہیں، ان کو گونہ پریشانی ہوئی، بہرحال مرضی مولا از ہمہ اولیٰ[2]"

لیکن مرضی مولا کو یہ منظور نہ تھا کہ اقبال حیدرآباد کے ہو رہتے۔ اگرچہ حیدرآباد
میں بھی اکثر یہ افواہیں پھیلتی رہتی تھیں کہ اقبال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنا دیئے گئے
کبھی یہ سننے میں آتا کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں، علیٰ ہذا القیاس، لیکن
ان میں سے کوئی خبر بھی حقیقت نہ بن سکی۔ حالانکہ اہل حیدرآباد اور خصوصاً مہاراجہ کشن پرشاد
اور اکبر حیدری وغیرہ جیسے ذی اثر حضرات دل سے چاہتے تھے کہ اقبال حیدرآباد
آجائیں، پھر کیا وجہ تھی کہ ایسا نہ ہو سکا، کیا حضور نظام کی مرضی نہیں تھی، ایسا بھی نہیں،
کیونکہ جب اقبال دوسری بار ۱۹۲۹ء میں توسیعی لکچروں کے سلسلے میں حیدرآباد گئے ہیں تو

---

[1] نقوش مکاتیب نمبر ص ۲۹۶ [2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۴

جس طرح آپ کا استقبال ہوا، اس کا حال ملاحظہ کیجئے۔

"آپ[1] ۱۸ جنوری کو حیدرآباد پہنچے۔ جہاں اسٹیشن پر ہی مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہوکر "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا"[2] کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ اسٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ یہیں آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لئے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانہ ہی جانا ہوگا۔ ۱۰ جنوری کی صبح کو ۱۱ بجے آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے ملے۔"

نظام سے اقبال کی یہ ملاقات نہایت دوستانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ نظام کے دربار میں جانے والوں کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف جاہی "دستار" اور "بگلس" لگائیں، لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ "پابندی" اقبال پر سے ہٹالی گئی تھی۔ حیدرآباد میں اس پابندی سے ہندوستان کے گنتی کے چند مشاہیر مستثنیٰ کئے گئے جن میں قائداعظم اور اقبال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس موقع پر حسب ذیل فارسی اشعار اقبال نے نظام کو سنائے تھے جو انہی کے لئے کہے گئے تھے۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں
از تو باقی سطوتِ دین مبیں
از تو مارا صبح خنداں شام ہند
آستانت مرکز اسلام ہند

[1] نیرنگ خیال، اقبال نمبر ۳۲ [2] صفحہ اول، مرقع اقبال، شائع کردہ مرکزی بزم اقبال، حیدرآباد، پاکستان ۱۹۴۸ء

کی نگاہ حسنِ ازل کی ایک جھلک دیکھتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کس طرح ان کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے یہ خبر ملی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے جو نہایت چمکیلا ہے۔ جس وقت علامہ اقبال کی ملاقات اعلیٰ حضرت سے ہوئی تو انہوں نے اس ہیرے کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا۔ اقبال نے پھر اس ہیرے کی چمک، اس کے وزن اور اس کے حسن کا مکمل تذکرہ کیا۔

جن لوگوں نے حیدرآباد کے سقوط اور زوال سے پہلے حیدرآباد کو نہیں دیکھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حیدرآباد کیا تھا۔ عام ریاستوں کے برخلاف وہ کتنی بڑی مملکت تھا، کیا آداب شاہی تھے اور دوسری دیسی ریاستوں کے رؤساء کے مقابلہ میں نظام کی حیثیت کتنی مہتم بالشان اور مطلق العنان تھی، ایسے دربار میں اقبال کی یہ پذیرائی اور ایسی سرکار سے اقبال کی یہ سادہ و بے تکلف بات چیت اس کا ثبوت ہے کہ نظام اقبال کو پسند کرتے تھے اور ان کے مخالف نہیں تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہاں ان کی ملازمت کی کوئی شکل نہیں بن سکی۔ پھر اس صورت میں کہ خود اقبال نظام اور حیدرآباد کی اخلاقی تائید اور خدمت کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے۔ ایک خط میں مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ سرکار والا کا تقرر حیدرآباد کے لئے بے انتہا برکات کا باعث ہوگا۔ بلکہ میں تو اس بات کا امیدوار ہوں کہ سرکار کا وجود باوجود ان تمام

له اقبال نامہ حصہ دوم ص۲۰۶ و ص۲۰۷

تھا عند الملاقات عرض کروں گا۔

حیدر آباد کا یہ پہلا سفر اقبال نے یورپ سے واپسی کے تقریباً ایک سال بعد کیا تھا۔ اس زمانے میں تخت آصف جاہی پر موجودہ نظام کے والد، اقبال کے استاد بھائی اور داغ کے شاگرد میر محبوب علی خاں آصف متمکن تھے۔ داغ[1] کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن اقبال کے بے تکلف دوست مولانا گرامی[2] شاعر دربار کی حیثیت سے دکن میں موجود تھے۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں آصف عجیب و غریب مزاج کے انسان تھے، کھڑے ہیں تو گھنٹوں کھڑے ہیں جاگ رہے ہیں تو پہروں جاگ رہے ہیں۔ اس میں دن اور رات کی کوئی قید نہیں تھی۔ دکن کے پرانے لوگوں میں "ولی" مشہور تھے۔ شکار کے لئے نکل گئے تو ہفتوں اسی شغل میں گزار دیئے۔ لکھ لٹ اور دریا دل تھے۔ جس نے ان کی ایک جھلک دیکھ لی یا دربار میں باریاب ہو گیا اس نے منہ مانگی مراد پائی اور دنیا سے بے نیاز کر دیا گیا۔ ان غیر معمولی مشاغل کے باوجود یہ بھی ان کی "کرامت" تھی کہ امور سلطنت کو وہ بحسن و خوبی انجام دیتے تھے لیکن ان کی آزمائشیں بڑی صبر آزما ہوتی تھیں۔ چنانچہ خود داغ[3] بھی دفعہ حیدر آباد گئے تو طویل مدت تک انتظار کرنے کے باوجود دربار نظام میں باریاب نہ ہو سکے اور وطن واپس ہو گئے۔ پھر اسی سال بلوائے گئے لیکن استادی کا "شرف" ساڑھے تین سال کے قیام کے بعد بخشا گیا پھر جس طرح نوازے گئے وہ اظہر من الشمس ہے ——— اقبال کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ چند سے انتظار کرتے۔ ویسے بھی ان کا "مقصد سفر" کچھ اور تھا۔[4] چنانچہ وہ اورنگ آباد ہوتے اور مغل اعظم عالمگیر کی مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے لاہور

[1،2] مولوی نصیر الدین ہاشمی مصنف "دکن میں اردو" کا مکتوب گرامی ہمارے ہاں محفوظ ہے۔

[3] داغ از نوری ص۔۔ [4] اقبال نامہ

لوٹ گئے۔ اس ساری تفصیل سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اقبال کو ابتداء ہی سے حیدرآباد اور حیدرآباد کے حالات سے دلچسپی رہی۔ دوسری بار ۱۹۲۹ء میں جب وہ حیدرآباد گئے تو ان کی ملاقات موجودہ نظام دکن سے ہوئی اور حیدرآباد کے حالات میں بھی زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا، جامعہ عثمانیہ کے قیام نے دکن کی ذہنی کایا پلٹ دی تھی۔ اب کی بار انہیں دکن میں بہت سے اقبال شناس بھی ملے، جو ان کے پیام کے آشنا اور ان کے بہت سے فلسفیانہ اور علمی مضامین کے ترجموں سے مسلح تھے، فطری طور پر اقبال کو نوجوانان دکن کی یہ ادائیں بھا گئیں اور انہیں حیدرآباد سے اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی چنانچہ اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ جب اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے ہیں اور ہندوستان کے آئینی مستقبل اور اس کی سیاسی الجھنوں کا حل صوبوں کی مکمل آزادی اور ان کو راست وزیر ہند کے تحت کر دینے کی اسکیم کی شکل میں پیش کرتے ہیں تو اس وقت بھی وہ حیدرآباد کو فراموش نہیں کرتے ہیں۔ بہادر یار جنگ[1] سے روایت ہے کہ ان سے خود اقبال نے کہا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس کے دوران نجی طور پر وزیر ہند اور انگلستان کے دوسرے مدبرین سے حیدرآباد کے آئینی موقف کے بار[ے م]یں گفتگو کرتے رہے اور انہیں اپنے دلائل سے قائل کر دیا کہ حیدرآباد کو اس کے مفوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ مفوضہ جاتی درجہ دے دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو۔ لیکن بدقسمتی سے خود حیدرآباد کے وفد کے سربراہ

لہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ٭ اس روایت کی حیدرآباد کے اور احباب بھی تصدیق کرتے ہیں۔ مثلاً عبداللہ السدوسی مصنف "مذاہب عالم کا سیاسی جائزہ" اور محمد احمد خان مصنف "اقبال کا سیاسی کارنامہ" وغیرہ۔ یہ دونوں حضرات آج کل کراچی میں ہیں۔

اکبر حیدری نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایسا عمل قبل از وقت ہوگا اور ممکن ہے اس اقدام سے ہندو جماعتیں ایجی ٹیشن کریں اور دوسری ریاستیں بھی ایسے ہی مطالبات نہ پیش کردیں۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں سے مرعوب ذہنیت نے ایک عظیم مدبر کے تاریخی اور انقلابی مشورہ کو پہلی ہی منزل میں مسترد کردیا، دوسرے لفظوں میں حیدرآباد کے مستقبل کو تاریکی کی انتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ اگرچہ یہ اہم واقعہ صرف ایک روایت ہے لیکن ایک اتنے بڑے، اچھے اور سچے انسان کی زبانی ہم تک پہنچا ہے کہ اسے غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بہادر یار جنگ بیان کرتے تھے کہ اس سعیٔ پرخلوص کی ناکامی کا اقبال کو آخر تک افسوس رہا۔ لیکن حیدرآباد سے اقبال کی یہی "دلچسپیاں" ہیں جو ان کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوئیں، اقبال، جن کے سفارشی خط لے کر لوگ حیدرآباد جاتے اور اعلیٰ ملازمتیں اور وظائف حاصل کر لیتے تھے، تو پھر خود ان کی عملی خدمات سے حیدرآباد کیوں محروم رہا؟ اس سوال کے جواب میں قیاس یہ کہتا ہے کہ باخبر اور ہوشمند انگریز جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ ہوتے تھے اور جس نے حیدرآباد میں وقار الملک، محسن الملک، ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر اور آخر میں علی امام کو "ٹکنے" نہ دیا تھا، وہ حیدرآباد میں اقبال جیسے "خطرہ" کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدرآبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدرآباد میں مستقل قیام نہ کرسکے۔ لیکن اس کا ملال بھی کو رہا کہ اقبال کے شایانِ شان عہدے کے "اختراع" اور "تجسس" نے دجو مرکا عظمت مدار

---

[۱] ملاحظہ ہو حضرت جوش ملیح آبادی کا تعارفی خط مرسلہ مہاراجہ کشن پرشاد (اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)

برطانیہ کے نمائندہ حیدرآباد کے اشارے سے کبھی وجود میں نہ آسکا) ایک سامنے کی بات کو اکابرِ دکن کی نظروں سے اوجھل کر دیا اور وہ سیدھی صاف سی بات تھی ان کے لئے معقول وظیفہ کا اجراء۔ اور یہ بات کچھ ایسی خشک بات بھی نہ تھی اور نہ اس سے کسی کو کوئی "خوف" ہو سکتا تھا۔ دیگر مشاہیر کے قطع نظر خود پنجاب کے ایک اور شاعر حفیظ جس ملک سے ماہانہ وظیفہ پا سکتے تھے وہاں اقبالؔ کے لئے کسی وظیفہ کا اجرا کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی کو سوجھا ہی نہیں اور سوجھا بھی تو اس وقت جب ریاست بھوپال نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ چنانچہ سر راس مسعود کو ۸ جون ۱۹۳۶ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں۔

"ہاں تم سن کر تعجب کروگے کہ سر اکبر حیدری کا خط مجھ کو لندن سے آیا ہے اور بہت دل خوش کن ہے۔"[1]

افسوس کہ یہ "دل خوش کن" خیال کبھی صورت پذیر نہ ہو سکا اور وظیفہ کی اجرائی کی کارروائی کا آغاز اس وقت کیا گیا جب اقبال ساری احتیاجات سے بے نیاز ہو کر ابدی نیند سو گئے!

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۸۵

پہلا یومِ اقبال

اہلِ حیدرآباد اس امتیاز کے بھی حامل ہیں کہ انہوں نے اقبال کی زندگی میں "یوم اقبال" منانے میں پہل کی۔ میری نظروں میں آج سے بیس سال پہلے کا حیدرآباد گھوم رہا ہے۔ دریادل، علم دوست اور فقیر منش امیروں کا حیدرآباد، درمیانہ طبقے کے خوش پوش کج کلاہوں کا حیدرآباد، امارت گزیدہ مولویوں اور گوشہ نشین علماء کا حیدرآباد، ہندو مسلم اتحاد کے نقطۂ عروج پر ستارہ کی طرح چمکنے والا حیدرآباد۔ اسی حیدرآباد نے مشرق کے سب سے بڑے انقلابی شاعر اور حکیم کو کس پُروقار اور والہانہ انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ یہ منظرِ زندگی بھر نہیں بھلایا جا سکتا۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کی خنک صبح اس طرح طلوع ہوئی کہ باغِ عامہ[1] کے پُر سکون اور خاموش ماحول میں ہلچل سی مچ گئی۔ نو بجتے بجتے پا پیادہ چلنے والوں، سائیکل سواروں اور لمبی لمبی رنگ برنگی موٹروں کا ایک جلوس ٹاؤن ہال (باغ عامہ) کی طرف رواں دواں نظر آنے لگا۔ وردی پوش سپاہی راستوں کے انتظامات پر مامور تھے۔ لوگ جوق در جوق ٹاؤن ہال

---

[1] حیدرآباد کا مشہور باغ۔ اس باغ عامہ میں واقع ایک عظیم الشان عمارت جسے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسی عمارت کو اسمبلی ہال میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

کے اندر داخل ہو رہے تھے تاکہ آرام دہ کرسیوں پر بیٹھنے کی جگہ حاصل کر سکیں۔ ہال بھر گیا ہال کے اوپر کی گیلریاں بھر گئیں حتیٰ کہ دروازوں اور کھڑکیوں پر مجمع نے قبضہ کر لیا۔ انسانوں کا ایک طوفان تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، اتنا بڑا اجتماع کہیں اور ہوتا تو شاید کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی لیکن یہاں سنجیدگی تھی پُر وقار سنجیدگی، شائستگی تھی، ایسی شائستگی جسے مشرقی تمدن کی آخری علامت کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تماشائی کم تھے اہلِ نظر زیادہ! پورے ماحول پر کسی شاہی دربار کا سا جلال طاری تھا۔ حالانکہ یہ دربار ایک درویش خدامست کا تھا، اس مرد قلندر کا دربار جس کی قدِ آدم تصویر اسٹیج پر کرسیٔ صدارت کے پیچھے رکھی ہوئی تھی۔ سارے مجمع کی آنکھیں اس تصویر پر لگی ہوئی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ تصویر اب بولنے ہی والی ہے۔ سب گوش بر آواز تھے! —— اتنے میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ یہ اعلان تھا کہ اس محفل کے صدر آ پہنچے۔ سارا مجمع ایستادہ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج لال، پیلی، ہری اور سفید دستاروں اور سادہ و پرکار شیروانیوں اور ان کے وسط میں چمکنے والے بکلسوں اور پیٹیوں سے بھر گیا۔ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ قرآن خوانی کے بعد فخر یار جنگ[ث] (صدر مسلم کلچر سوسائٹی) نے تحریک صدارت کی اور نظام دکن کے ولی عہد شہزادۂ برار نے مخصوص شاہانہ انداز میں کرسی صدارت سنبھالی، گویا ایک قلندر کی مجلس میں شاہ و گدا کا مرتبہ ایک ہو گیا۔ اقبال کے حضور حیدر آباد کے اہلِ علم کے اظہارِ عقیدت کا یہ انداز ممکن ہے آج کچھ غیر ترقی پسندانہ معلوم ہو لیکن ۱۹۳۸ء اور اس سے

---

[۱] نظام دکن یا ان کے شہزادے جب کہیں جاتے تو پولیس کے سپاہی اپنی سیٹیاں بجا کر لوگوں کو ہوشیار کرتے تھے [۲] ۱۹۳۸ء حیدر آباد کا درباری لباس [۳] پاکستان میں حیدر آباد کے سابق ایجنٹ جنرل جناب مشتاق احمد خاں کے والد بزرگوار اور اس وقت کے وزیر مالیات۔

پہلے کے حیدر آباد میں اتنا بڑا اعزاز کبھی کسی کو نہیں حاصل ہوا تھا۔ "فرنگی مدنیت" کی فتوحات کا آشنرہ ہونے والا "یارِ وفادار"، سیاستِ افرنگ کے سب سے بڑے باغی شاعر کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کر رہا تھا۔

"یہ امر میری انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آج میں اس تقریب میں بذاتِ خود شریک ہوں، جو آپ مشرق کے مایۂ ناز شاعر سر محمد اقبال کی ادبی اور فلسفیانہ خدمات پر حیدر آباد کی طرف سے اظہارِ استحسان کے لئے منعقد کر رہے ہیں۔ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعہ مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے بجا طور پر وہ دنیا کا ایک بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے۔ اور بحیثیت شاعر وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدر آباد اعتراف کر رہا ہے۔

خواتین و حضرات! میں اس تقریب کی کامیابی کا دل سے متمنی ہوں۔"[1]

شہزادہ برار کی مختصر سی افتتاحی تقریر کے بعد سر اکبر حیدری نے بحیثیتِ امیر جامعہ عثمانیہ اقبال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان کے بعد حسبِ ذیل پیغامات سنائے گئے۔

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور[2]

"ہندوستان کے شاعرِ اعظم کے "یوم" منانے میں میری مسرتیں بھی آپ کے ساتھ ہیں مجھے عمر بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اقبال جیسے شاعرِ اعظم کا کلام اردو اور فارسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اصلی و ادبی حسن کارانہ روپ میں

[1] سب رس "اقبال نمبر" صفحہ ۵۰ [2] سب رس اقبال نمبر صفحہ ۵۰۔۵۱

نہ دیکھ سکا۔ خدا اقبال کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رکھے“

مسز سروجنی نائیڈو۔

”میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا عظیم ترین شاعر سمجھتی ہوں۔ اس شاعر کے اردو اور فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست رہبر و رہنما ثابت ہوں گے۔“

پنڈت جواہر لال نہرو

”اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعرِ اعظم کے نغموں کی وجہ سے موجود نسل زبردست متاثر ہوئی۔ اقبال کی خداداد قابلیت کا ہر شخص معترف ہے۔ ”یوم اقبال“ کی کامیابی کی توقع پر مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔“

ہز ہائینس آغا خاں

”اقبال جو اردو اور فارسی زبانوں کا مایۂ ناز شاعرِ اعظم ہے اس کا یوم منا کر آپ نے اسلامی تہذیب کو درخشاں کر دیا۔ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی قومیت کے راز پوشیدہ ہیں۔“

ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال

”مجھے مسرت ہوئی کہ ”یوم اقبال“ ہز ہائینس پرنس آف برار ولیعہد خانوادۂ آصفی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قومیت کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہلِ ہند کو خوابِ غفلت سے چونکا کر ان میں احساسِ بیداری پیدا کر دیا۔“

ہز ہائینس نواب صاحب رامپور

"اقبال ڈے کے شاندار موقع پر مجھے مبارک باد کہنے کی مسرت حاصل ہو رہی ہے اس شاعر اعظم نے اردو، فارسی شاعری کے علاوہ فلسفہ کی جتنی خدمت انجام دی ہے اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔"

سر سکندر حیات خاں

"میں انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ شاعر اعظم کا یوم ہز ہائینس پرنس آف برار کی صدارت میں شاندار طریقے سے منایا جا رہا ہے ۔ اس فلسفی شاعر کے پرستاروں کی بہترین توقعات مسلم کلچر سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔"

لاتعداد پیامات میں سے چند منتخب پیام نقل کر دیئے گئے ہیں تاکہ جلسہ کی اہمیت اور انتظام و اہتمام کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکے۔ پیامات کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف[1] نے اقبال پر انگریزی میں تقریر کی اور اقبال کے موضوعات شعر اور مشرقی تمدنی روایات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اقبال کا کلام نہ خالص شاعری کا روپ رکھتا ہے نہ نرے فلسفہ کا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس نے عرفانِ عمرانی کے مرکب کی شکل پائی ہے۔ عرفانِ عمرانی

---

[1] ڈاکٹر عبداللطیف کی شخصیت ادب اور سیاست کی دنیا میں معروف شخصیت ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ حیدرآباد کے لاتعداد اہلِ قلم کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اخبار نویسی اور تصنیف و تالیف میں اپنے آپ کو مشغول اور معروف رکھا اور اس میدان کے شہسواروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی تصانیف "مین غالب" اور "ہندوستانی تہذیب کا مستقبل" نے بڑی شہرت پائی۔ ڈاکٹر صاحب کے اقبال سے ذاتی مراسم بھی تھے۔

کی ترکیب کی وضاحت انہوں نے یہ کی تھی کہ اقبال کا عالمی تصور، زندگی کے جس پیام جاوید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے روحِ فطرت میں کار فرما رہا ہے اور بنی نوع انسان کی حیات ملی کے لئے ایک ایسے مطمحِ نظر کو متعین کرتا ہے جسے آج کی دنیا میں ہر جگہ فراموش کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر عبد اللطیف کے بعد ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ[1] نے اقبال کے محاسن شعری پر مقالہ پڑھا اور ثابت کیا کہ تخیل اقبال نے فکر کی جولانیوں کے لئے ایسے میدان کھول دیئے ہیں کہ جن کی طرف اس سے پہلے اردو شاعروں کی توجہ منعطف نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں سے اردو شاعری کو نجات دلائی اور ان کی جگہ حقائق کی تلمیحوں اور سیاسیات حاضرہ کے مشکل مسائل کو اس خوبی سے شاعری کا جامہ پہنایا کہ اب اردو شاعری کے موضوعات ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی

---

[1] ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی شخصیت ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کا نام اور کام اس برصغیر میں بہت بڑی حیثیت اور قابلِ رشک شہرت کا حامل ہے۔ خصوصاً دکنی ادب کے تحفظ و تعارف کی ساری جد و جہد آپ کی اور صرف آپ کی ذات کی مرہونِ منت ہے۔ اردو ادب کی تاریخ آپ کے احسانات کے بار گراں سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد ڈال کر آپ نے حیدرآباد کے اہل قلم میں مدتوں کے سوئے ہوئے احساسِ خودی کو بیدار کر دیا تھا اور ایک خاص ڈگر پر چلنے والے ادبی رجحانات کی ایک روشن مستقبل اور معین منزل کی طرف رہنمائی کی تھی۔ آپ مولوی وحید الدین سلیم کے ایسے فطین شاگردوں میں سے ہیں جن پر خود استاد کو بھی ناز تھا۔ ایسی لچھو ڈس افدار کا حامل نقاد ہی داغؔ، امیرؔ اور جلیلؔ کی آوازوں سے مانوس فضا میں اقبال کی شاعری کی خصوصیات کو اس انداز سے پیش کر سکتا تھا۔

اکبرؔ وفا قانی[1] نے کلامِ اقبال کے حسن کارانہ پہلو پر ایک دلچسپ تقریر کی۔ ان کی تقریر کا عنوان ذرا انوکھا اور چونکا دینے والا تھا۔ اکبر صاحب کا خیال ہے شاعری حسن کاری کا سب سے بلند مظہر ہے اور شاعر حسن کاری کا مبالغہ، شاعر ایک ایسا حسن کار ہوتا ہے جو رنگ و موقلم، سنگ و تیشہ، اور رباب و مضراب کی بجائے الفاظ اور قلم کو تخلیق کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لئے جتنا بڑا شاعر ہوگا اتنا ہی بڑا حسن کار ہوگا۔ شاعری کو جب حسن کارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو شعر ایک رنگین تصویر، خوب صورت مجسمہ اور دلکش نغمہ بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے کلامِ اقبال کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اقبال نہ صرف اردو اور فارسی کا بڑا شاعر ہے بلکہ وہ ہندوستان کا سب سے انوکھا حسن کار بھی ہے۔ اور اس کی حسن کاری میں مغربی پرتو کے ساتھ ساتھ مشرقی خوبیاں اور مسلم ذہنیت کی رنگا رنگی بھی ملتی ہے اس کے بعد انہوں نے اقبال کی بہت سی ایسی نظموں کو مثال کے طور پیش کیا تھا جن کے چھوٹے اور بڑے کنوس پر شاعر نے لفظوں کے ذریعہ رنگ بھرا تھا۔[2]

---

[1] اکبرؔ وفاقانی صاحب حیدرآباد کے ان خوش نصیب فرزندوں میں سے ہیں جو اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور رنگا رنگ شخصیت کی وجہ سے اپنے دورِ جہد و عمل میں عوام میں مقبول اور خواص میں محبوب تھے روزنامہ منشور، نقش، وقت اور صبح دکن کے کالموں میں اکبر صاحب مدتوں تک ایک اخبار نویس کی حیثیت سے چمکتے رہے۔ مسز سروجنی نائیڈو کے موضوعی شاعروں میں ایک جدت طراز شاعر کے روپ میں رنگ جاتے رہے۔ بولتی فلموں نے جب سارے ملک میں اردو ڈرامے کے مذاق کو مٹا دیا تھا تو اکبر صاحب اپنے ڈراموں کے ذریعہ حیدرآباد میں اسٹیج کی روایات کو زندہ کر رہے تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا لیکن ان کا دفتر وکالت حیدرآباد کے مائیہ ناز اور نامور مصور عبدالقیوم مرحوم کے اسٹوڈیو میں واقع تھا اور ان کا زیادہ وقت اپنے پیشہ کے کاروبار کی بجائے تصویروں کے خطوط اور رنگ آمیزیوں کے نقد و بحث میں گزرتا تھا۔

[2] سب رس: اقبال نمبر

یوم اقبال کی پہلی نشست میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی ایک پر مغز مقالہ پڑھا تھا، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے اس کی نقل حاصل نہ کی جا سکی۔ ان مقالوں کے علاوہ جن شعراء نے اقبالؔ پر نظمیں پڑھی تھیں وہ آپ اس باب کے آخری صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔ اب ہم یوم اقبال کی دوسری نشست کی روداد پیش کرتے ہیں۔

دوسری نشست سہ پہر میں منعقد ہوئی تھی۔ حاضرین کی تعداد صبح کے اجلاس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس جلسہ کی صدارت اقبال کے ایک قدیم مداح اور دوست مہاراجہ کشن پرشاد کرنے والے تھے۔ اقبال کے مہاراجہ سے مراسم کی تفصیلات آپ اسی کتاب کے تیسرے باب میں دیکھیں گے۔ دوسری وجہ اور اہم وجہ یہ تھی کہ اس جلسہ میں مسلمانوں کے محبوب قائد نواب بہادر یار جنگ کی تقریر ہونے والی تھی۔ اہلِ حیدر آباد نے اقبالؔ کے مردِ مومن کو بہادر یار جنگ کی ذات میں چلتا پھرتا دیکھا تھا۔ گفتار کے تو وہ غازی تھے ہی لیکن ان کا کردار بھی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔ کلام اقبال کی تشریح اور توضیح اور وہ بھی بہادر یار جنگ کی زبان سے، عجیب کیفیت طاری تھی، عجیب درد و سوز اور مدہوشی کا عالم تھا کہ جس کے بیان کے لئے زبان میں یارا نہیں۔ اسی عالمِ کیف و سرور کی وجہ سے نواب صاحب کی وہ یادگار اور شاہکار تقریر محفوظ نہ کی جا سکی۔ ہاں سننے والوں کے دلوں میں اس کی ایک خوشگوار یاد باقی رہ گئی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ کی تقریر کے علاوہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مخدوم محی الدین نے بھی اس جلسہ میں مقالے پڑھے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا مقالہ ہمارے خیال میں خاکہ تھا اس اہم کتاب کا جو بعد میں "روحِ اقبالؔ" کے نام سے شائع ہوئی جس کے مطالعہ کے بغیر اقبال پر کوئی کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ "روحِ اقبال" پر ہمارا

تصو اقبال پر مطبوعات کے باب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے خطبے کا آغاز ان جملوں سے کیا تھا۔

"اردو شاعری کے جنم بھومی میں آج کا دن ایک یادگار دن ہے کیونکہ آج ہم سر اقبال جیسے مشہور اور مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مجھے اس کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسے کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا میرے سر اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھہراتے ہیں:"

خطبۂ صدارت کے اگلے حصوں میں اردو شاعری کے ماضی کا حال بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ہمارے عہد گذشتہ کی شاعری فنی نقطۂ نظر سے کتنی ہی کامیاب رہی لیکن اس نے ہماری حیاتِ اجتماعی پر اچھا اثر نہیں ڈالا اور ہمارا سرمایۂ شعری "جمالیاتی" اور "حزنیہ" کیفیات تک محدود ہے لیکن ہندوستان میں شعری انقلاب کا باعث اقبال کا کلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال آج جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے، وہ اس کا جائز حق ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ظلم ہوتا اگر مشرق کے اس عظیم شاعر کی زندگی میں ہم اسے خراج عقیدت نہ پیش کرتے اور اہلِ ملک اقبال کا وہ "قرض" ادا نہ کر دیتے جو ادبی اور علمی حیثیت میں ان پر واجب تھا۔

مہاراجہ کے خطبۂ صدارت کے بعد مخدوم محی الدین[1] نے بعنوان "مجاہد اقبال" مقالہ پڑھا

---

[1] سب رس اقبال نمبر [1] مخدوم محی الدین کی زندگی مسلسل جہاد میں گزری اور گذر رہی ہے۔ حالانکہ وہ اب جس پارٹی (کمیونسٹ) سے منسلک ہیں اس کے نزدیک جہاد اور مجاہد جیسے لفظوں سے جو تقدس وابستہ ہے ممکن ہے کہ بے معنی ہو لیکن جب یہ مقالہ لکھا اور پڑھا گیا، اس وقت یقیناً ان الفاظ کا سارا تقدس مخدوم کے

خاص خاص باتیں یہ تھیں کہ اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں۔ اسی مناسبت سے ان پر بحث کی جاتی ہے اور انہیں پہلوؤں میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے۔ اقبال کے پیشِ نظر اجتماعی اور انفرادی سیرت کا ایک مخصوص تصور ہے۔ اور جب بھی وہ کسی کو اپنے نصب العین سے ہٹا ہوا پاتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کردار و عمل کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اور اسے بھی کلامِ اقبال کا کارنامہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک مادہ پرست ذہن روحانی اقدار کی ابدیت کا قائل ہو گیا۔ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ حیدر آباد میں ترقی پسند شاعری کا چراغ مخدوم ہی کے ہاتھوں روشن ہوا۔ ان کا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" حجم میں کم سہی لیکن اس کی بیشتر نظمیں یقیناً ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ۱۹۴۶ء میں مخدوم نے "ترانۂ پاکستان" بھی لکھا تھا جسے مجاز نے اپنی دماغی علالت کے زمانے میں تھوڑے سے ردوبدل کے بعد اپنے نام سے شائع کروایا تھا۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد کمیونسٹ پارٹی کے مشہور ہفتہ وار اخبار "نیا زمانہ" بمبئی نے حقیقتِ حال کا انکشاف کر دیا، اس ترانہ کے چند شعر ہمیں اب بھی یاد ہیں جو یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ مصنف کا روحِ اقبال سے تعلق واضح ہو جائے۔ ویسے بھی اقبال کے بغیر پاکستان کا تصور بے معنی سا ہے۔ شعر یہ تھے۔

پاکستان ہمارا، پاکستان ہمارا

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا

راوی کی لہروں پر ناچا ایک ہلال اک تارا

سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا

پربت کے سینے سے چھوٹا گیا سرکش دھارا

سامراج کا سوکھا جنگل اس میں لال شرارا

پاکستان ہمارا، پاکستان ہمارا

؎ سب رس اقبال نمبر

تو اس کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہے۔

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مخدوم کی رائے میں یہی مجاہد کی تعریف ہے، ان کے خیال میں یہی بندۂ گستاخ کہیں اقبالؔ کہیں مومن، کہیں قلندر اور کہیں مردِ کامل کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور دنیا کی تاریخ میں یہ مردِ مجاہد ہر عہد کے سماجی حالات کے مطابق کبھی مصلح، کبھی مدبر، کبھی شاعر اور کبھی پیغمبروں کے روپ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ وہ حق پرست اور باطل شکن ہوتا ہے۔ وہ اپنے بیگانوں میں امتیاز نہیں کرتا۔ وہ فرعون کے لئے موسٰی اور لات و منات کے لئے محمدؐ ہے۔

یہ مقالہ کافی طویل تھا لیکن شگفتہ اندازِ بیان کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا۔ اب ہم وہ نظمیں پیش کرتے ہیں جو یومِ اقبالؔ میں پڑھی گئیں۔ یہ علی الترتیب مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، اور صاحبزادہ میکشؔ مرحوم کی ہیں۔

مخدوم سے آپ متعارف ہو چکے ہیں، سکندر علی وجد کا شمار اردو شاعری کی جدید نسل کی صفِ اول میں کیا جاتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری سے وہ اس درجہ متاثر رہے ہیں کہ اقبالؔ کو اگر ان کا روحانی مرشد کہا جائے تو مناسب ہے۔ اب تک ان کے دو مجموعے "لہو ترنگ" اور "آفتاب تازہ" منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

صاحبزادہ میکشؔ کو مرحوم لکھتے ہوئے آج بھی ہاتھ لرزتے ہیں حالانکہ اس حادثۂ جانکاہ کو گذرے تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ میکشؔ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا، ایسا زودگو شاعر اور ادیب نظر سے کم گذرا ہے۔ ماہانہ سب رس کا اقبالؔ نمبر اسی نے مرتب کیا تھا۔ اس نے اپنے کلام کے تین مجموعے "گریہ و تبسم"، "نوید" اور "کاغذ کی ناؤ" اپنی یادگار چھوڑے ہیں

جو اس کی جوانمرگی کے غم کو ہمیشہ تازہ کرتے رہیں گے۔

اقبالؔ[۱]

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانب مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

ایک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا

وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کُو بہ کُو، کوچہ بہ کوچہ، در بہ در گاتا گیا

گیت سننے کے لئے خلق خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے

راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

مخدوم محی الدین

اقبالؔ

مبارک ہو جہانِ شعر کی پیغمبری تجھ کو
ملی ہے شاعرانِ خوش نوا کی سروری تجھ کو

دلوں میں احترامِ عشق پیدا کر دیا تو نے
سخن کو دم میں ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے

گراں خوابی ہوئی کافور تیری ضربِ پیہم سے
ہوئی سرسبز کشتِ ملتِ بیضا ترے دم سے

ترا ہر شعر دل کی سمت پورا وار ہے گویا
زبانِ پاک تیری تیغِ جوہر دار ہے گویا

ترے فیضِ نظر سے حریت کی بزم روشن ہے
تری ضربِ کلیمی سے غلامی لرزہ بر تن ہے

---

[۱] سب رس اقبال نمبر [۲] ابد ترنگ (مجموعۂ کلام وجد)

اشاروں میں دیا درسِ رموزِ بے خودی تو نے ۔ فنا کو بڑھ کے دکھلایا چراغِ زندگی تو نے

ترا سازِ خودی جس دم حقیقت پاش ہوتا ہے ۔ مثالِ صبح رازِ زندگانی فاش ہوتا ہے

خرد بیزار تھی آشفتگی کے آستانے سے ۔ اسے تو راہ پر لایا جنوں کے تازیانے سے

کہاں ہوتے ہیں تجھ سے اہلِ دل اہلِ نظر پیدا ۔ کئے تیری نگاہوں نے ہزاروں دیدہ ور پیدا

جہاں میں نام پیدا کر لیا ہے ہم نشینوں نے ۔ کئی خرمن بنا ڈالے ہیں تیرے خوشہ چینوں نے

اُسے کیا قحطِ مے ہو جس کی جانب چشمِ ساقی ہے ۔ تجھے کیا غم ہے اے اردو ابھی اقبال باقی ہے

سکندر علی وجد

اقبال[1]

سونے والوں کو، پیامِ صبحِ نو، دیتی ہوئی ۔ خواب کی دنیا اٹھی، انگڑائیاں لیتی ہوئی

مطلعِ مشرق پہ چمکا، آفتابِ شاعری ۔ ہر کرن، جس کی بنی، تارِ ربابِ شاعری

دِل پہ تھا جو داغِ غفلت اسکو آہیں دھو گئیں ۔ خونِ مشرق میں ہزاروں بجلیاں حل ہو گئیں

ضبط کے زخمِ نہاں، فریاد سے بھرنے لگے ۔ یعنی بندے بھی خدا سے گفتگو کرنے لگے

عارضِ پُرنور جھلکا، گیسوئے شب رنگ سے ۔ جو تارِ سازِ دل نکلی سکوتِ سنگ سے

اشکِ خونیں میں نظر آئی تبسم کی جھلک ۔ نغمۂ بلبل بنی، خاموش پھولوں کی مہک

کارواں بڑھنے لگا، تیزی سے منزل کی طرف ۔ کائناتِ درد خود کھنچنے لگی، دل کی طرف

دہر کے دھارے پہ طوفانی ہوا، بہنے لگی ۔ ناؤ مشرق کی کنارے کی طرف بہنے لگی

جاگ اٹھا، خرقِ دلِ اقبال کی دھڑکن گواہ ۔ واہ کا محشر لئے آتی ہے جس کے لب پہ آہ

قلبِ شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری

سچ کہا ہے شاعری جزویست از پیغمبری

میکش

---

[1] گریہ و تبسم (مجموعۂ کلام میکش)

بزمِ اقبال اور حلقۂ درسِ اقبال

اقبال کی وفات سے قبل حیدرآباد میں اقبال پر جتنا کام ہوا وہ انفرادی نوعیت کا تھا۔ البتہ اقبال کی زندگی میں یومِ اقبال کی تقریب جو شاندار اور عظیم الشان پیمانے پر منائی گئی اس کا اہتمام حیدرآباد کی مسلم کلچر سوسائٹی نے کیا تھا۔ اس کوشش کو اس کی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے ہم اقبال پر اجتماعی اور وسیع کام کے سلسلے میں پہلا قدم کہہ سکتے ہیں۔ اسی اجتماع کے بعد حیدرآباد میں بزمِ اقبال (اقبال سوسائٹی) قائم ہوئی اور اس کی شاخیں تمام اضلاعِ حیدرآباد میں پھیل گئیں۔ "بزمِ اقبال" کا کام حیدرآباد اور اضلاعِ حیدرآباد تک محدود نہ تھا اسی بزم نے بمبئی اور میسور میں بھی "یومِ اقبال" کی تقریبیں منعقد کی تھیں۔ دی انڈین پی۔ای۔این کے پہلی جون ۱۹۴۶ء کے شمارہ میں ایسے اجتماعات کی رپورٹ کے سلسلے میں صفحہ ۴۴ پر درج ہے۔

"اقبال کی یاد بمبئی میں ۲۷ر اور ۲۸ر اپریل کو منائی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام اکیڈمی آف اسلام اور اقبال سوسائٹی نے کیا تھا۔ نواب حسن یار جنگ[1] بانیٔ اقبال سوسائٹی حیدرآباد نے افتتاح کیا:"

---

[1] نواب حسن یار جنگ امیر پائیگاہ اور حیدرآباد کے شاہی خاندان کے ایک ممتاز رکن ہونے (باقی بر صفحہ آئندہ)

بانیٔ "بزمِ اقبال" (اقبال سوسائٹی) نے افتتاح ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس کے اہتمام میں بھی حصہ لیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد اسی بزم کی کوششوں سے میسور میں بھی "یومِ اقبال" منایا گیا۔ ۱۱ راپریل ۱۹۴۳ء کے "یومِ اقبال" کے خطبہ استقبالیہ میں نواب حسن یار جنگ نے "بزمِ اقبال" کی سرگرمیوں کی تفصیلات بتائی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

بزمِ اقبال کا قیام یکم شہریور ۱۳۴۵ف مطابق ... کو عمل میں آیا

اس بزم کا مقصد علامہ اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ کی تحقیق و ریسرچ کرنا اور ان کے کلام و پیام کو صحیح معنوں میں قوم کے روبرو پیش کرکے ان کی تشریح کرنا ہے چنانچہ اس ضمن میں ایک اسٹڈی سرکل قائم ہے۔ جس کی رو سے پرستاران اقبال کو ان کے کلام کو غور و فکر کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے طلبا اپنے مقالوں کی تیاری میں تحقیق کرکے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ بزم کی جانب سے علم بلڈنگ

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اور حالی کے ممدوح سر وقار الامراء کے فرزند دلبند سلطان الملک کے ایوانِ رفیع میں آنکھیں کھولنے کے باوجود درویش خرامت اقبال کے شیدا اور اس کے پیام کے مداح ہیں حیدرآباد میں بزمِ اقبال کی قابلِ رشک ترقی و توسیع اور اس کی دس سالہ کارگردگی صرف آپ کی ذاتی دلچسپی اور توجہ کی مرہونِ منت ہے۔ امرا میں ایسا علمی شغف کم پایا جاتا ہے۔ حصولِ تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ اور انگلستان میں مدتوں رہ چکے ہیں۔ اور روس، ترکی، فرانس، جرمنی، اٹلی اور مصر کی سیاحت کرچکے ہیں۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سے فیلو شپ حاصل کرچکے ہیں۔ حیدرآباد کا جو وفد سقوطِ حیدرآباد سے پہلے اسلامی ممالک کے دورے پر بھیجا گیا تھا۔ اس کے ایک اہم رکن آپ بھی تھے۔ آج کل کراچی میں خاموش اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

میں ایک دارالمطالعہ قائم ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں تقریباً ان سب کو فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے اخبارات و رسائل میں علامہ اقبال اور ان کے کلام پر جس قدر مضامین اور مقالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حیدرآباد و بیرونِ حیدرآباد میں جہاں جہاں "یوم اقبال" منائے گئے ان سب کا ریکارڈ بھی جمع کیا گیا ہے اور یہ کام مسلسل جاری ہے۔ چنانچہ ان کتابوں کی نمائش کے لئے جو انتظام کیا جا رہا ہے اس میں ان سب چیزوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔

بزمِ اقبال کی جانب سے ماہانہ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں جن میں ملک و بیرونِ ملک کے قابل افراد اقبال کے کلام اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جن میں جامعہ عثمانیہ کے قابل اساتذہ کے علاوہ سر عبدالقادر، مولانا سلیمان ندوی، مولانا خواجہ حسن نظامی اور مولانا سر حسن سہروردی وغیرہ مشہور ادباء بھی تقریریں کر چکے ہیں۔ انگلستان کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر آسوالڈ جبانے بھی "جمہوریت اور اقبال" پر ایک بصیرت افروز تقریر کی تھی۔

"بزمِ اقبال" کی جانب سے ہر سال نہایت کامیابی کے ساتھ دارالسلطنت ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں "یوم اقبال" منایا جاتا ہے اور ملک کے قابل اشخاص ان جلسوں کی کامیابی کے لئے حتی الامکان کوشش کرتے رہے ہیں چنانچہ ان جلسوں میں ملک کی جن قابلِ احترام ہستیوں نے پیام ارسال کئے ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔ ہز ہائینس والاشان پرنس اور پرنسس آف برار، شاعر سرپا بندر ناتھ ٹیگور مرحوم، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر محمد علی جناح، مولانا خواجہ حسن نظامی، سر اکبر حیدری مرحوم، نواب صاحب بھوپال وغیرہ شامل ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس بزم کی سرپرستی بلا تخصیص مذہب و ملت ہر قوم کے افراد

کرتے آرہے ہیں۔ چنانچہ معتمد عمومی مولوی اصغر حسین صاحب ایم۔ سی۔ ایس (حیدرآباد

سیول سروس) ہیں اور پہلے صدر نواب کیقباد جنگ تھے۔ اور مسز سروجنی نائیڈو

بھی اس کے ایک سالانہ جلسہ "یوم اقبال" کی صدارت کر چکی ہیں ..... بزم اقبال علامہ

اقبال کے کلام کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر علمی و ملکی تحریکوں میں حصہ لینے

سے پیچھے نہیں ہٹتی چنانچہ ۱۲ار بہمن ۱۳۴۹ف (مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء) کو بزم اقبال

کے زیر اہتمام مولانا جمال الدین افغانی کی تحریک و تعلیم کا ایک صد سالہ جشن "یوم جمال الدین

افغانی" اسی ہال میں نہایت کامیابی کے ساتھ منایا گیا۔ چنانچہ اس طرح بزم اقبال

خاموشی سے مگر استقلال سے ادبی اور ملکی خدمت کئے جا رہی ہے۔"

"بزم اقبال کی سرگرمیاں صرف ماہانہ اور سالانہ اجتماعات تک محدود نہ تھیں بلکہ بعد میں

اس بزم نے اقبال سے متعلق مطبوعات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ مطبوعات کے سلسلہ میں

اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ اقبال کے کلام کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جائے

اور کوئی نہ کوئی نایاب معلومات اقبال کے متعلق فراہم کی جائیں۔ چنانچہ بزم اقبال کی جانب

سے شائع کردہ پہلی کتاب اقبال کے فلسفۂ حیات و موت پر ایک مضمون کا عربی ترجمہ ہے۔

اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ آپ حیدرآباد میں اقبال پر مطبوعات والے باب میں پڑھیں گے۔

لیکن بزم کے صدر اور اس کے پرجوش و باہمت ارکان کے کیا عزائم تھے، اس کی ایک

جھلک ہم آپ کو یہاں دکھاتے ہیں۔ "الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال" کے پیش لفظ میں بزم

اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ لکھتے ہیں۔

ؔ پارسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑے صاحب ذوق بزرگ ہیں۔

"یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری بزم کی جانب سے طبع ہو کر شائع کی جا رہی ہے۔ حکمت حیدر آباد کی مرکزی بزم اقبال علامہ اقبال کے کلام و پیام کی اشاعت کے سلسلے میں آج تقریباً پانچ سال سے نہایت اہم کام انجام دے رہی ہے۔ اس بزم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ دنیا کے ہر اہم مقام پر اور خصوصاً اسلامی ممالک کے ہر بڑے شہر میں بزم ہائے اقبال کا قیام عمل میں لایا جائے چنانچہ اس کام کی انجام دہی کے لئے ایران، افغانستان، عراق وغیرہ میں کام شروع کر دیا گیا ہے ...... ہم لندن، نیویارک، ڈربن، (جنوبی افریقہ) میں بھی بزمیں قائم کرنے کا کام نہایت کامیابی سے کر رہے ہیں اور جنگ کے بادلوں کے پوری طرح چھٹ جانے کے بعد یورپ کے دیگر دارالسلطنتوں آسٹریلیا، چین اور جاپان میں بھی اس کام کی تکمیل کی طرف توجہ کی جائے گی۔

خدا سے میری دعا ہے کہ وہ اس شاعر مشرق کے کام کو دنیا کے ہر گوشہ اور ہر مسلمان کے کان تک پہنچا دے تاکہ ہم اس مفکر اعظم کے اعلیٰ خیالات سے مستفید ہو کر اپنی کھوئی ہوئی منزل کو جلد سے جلد پا سکیں۔"

اتنا کام ہوا تھا اور ایسے بلند ارادے تھے لیکن انقلاب حیدر آباد نے وہ بساط ہی الٹ دی ع

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال!

بزم اقبال کی طرف سے جو دوسری کتاب بزم کے دسویں سالانہ اجلاس کے موقع پر شائع کی گئی وہ کئی اعتبار سے اہم اور انوکھی ہے اس مصور کتاب کا نام ہے "مرقع اقبال" اپریل ۱۹۴۸ء کے یوم اقبال کے سلسلے میں بزم اقبال کی طرف سے اقبال کے اشعار کے

دیدہ زیب کتبوں اور تصویروں کی نمائش بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس نمائش میں حیدر آباد کے مصور[1] کے علاوہ خان بہادر عبدالرحمان چغتائی کی بھی ساٹھ تصویریں پیش کی گئی تھیں، جو خاص طور سے اسی نمائش کے لئے بنوائی گئی تھیں۔ اس کام کے بارے میں نمائش کے ناظم اعلےٰ خواجہ محمد احمد[2] صاحب لکھتے ہیں

"اس نمائش کو جسے قرآن السعدین کہا جا سکتا ہے ایک زبردست تحریک کی تمہید سمجھئے۔ میں کسی راز کو افشا نہیں کر رہا ہوں اگر یہ کہوں کہ ہمارے بلند ہمت صدر اور پختہ قلم مصور اس فکر میں ہیں کہ ایک خاص کمیٹی کے انتخاب کردہ اقبال کے اشعار کو مصور شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ ان کی تیاری میں چغتائی صاحب اپنی پوری توانائیوں کو روبہ عمل لائیں گے اور وہ چغتائی صاحب کے بہترین شاہکار ہوں گے۔ یہ مرقع "مرد مومن" کے نام سے رونما ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ اس کی طباعت بلاک سازی اور جلد سازی کا کام امریکہ میں انجام پائے اور وہ مسلمانوں کی ثقافت کے نمونے کی حیثیت سے دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کے لئے ایک حسین اور وقیع ورثہ بن جائے:"

افسوس کہ یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے پیش خاکہ کے طور پر "مرقع اقبال" کو ۱۹۷۸ء ہی میں بزم اقبال نے شائع کر دیا تھا۔ اس کی تفصیلات بھی آپ "حیدر آباد میں اقبالی مطبوعات" میں دیکھیں گے۔ اس کے علاوہ بزم نے تلگو زبان کے مشہور اسکالر قاسم خاں سے

---

[1] مرقع اقبال [2] خواجہ محمد احمد صاحب سی۔ پی کے رہنے والے تھے عمر کا بیشتر حصہ حیدر آباد میں گزارا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین میں سے ہیں۔ چنانچہ اسی محکمہ کے ناظم کی حیثیت سے پنشن لی۔

اقبال کے منتخب کلام کا تلگو زبان میں ترجمہ کروانا شروع کیا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اقبالیات کے سلسلے میں ایک اہم کتاب عطیہ بیگم فیضی کی ہے۔ اس کی اولین اشاعت بھی بزم اقبال کے صدر نواب حسن یار جنگ ہی کے ایما پر ہوئی تھی چنانچہ بمبئی میں شائع ہونے والے نسخہ کے صفحہ اول پر نواب حسن یار جنگ کی تصویر بھی بڑے اہتمام اور بہت اچھے فٹ نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ پیش لفظ[۱] میں بھی عطیہ بیگم نے بزم اقبال حیدر آباد کی سرگرمیوں کا بڑے شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ بزم اقبال کے تعاون سے حیدر آباد سے ایک ہفتہ وار اخبار "اقبال" بھی سرمست خاں آزاد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے کچھ شمارے، جو نواب حسن یار جنگ نے از راہِ کرم ہمیں عنایت کئے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ہیں جلد (۸) نمبر (۱۰) روز جمعہ، ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء کا شمارہ اقبال نمبر[۲] ہے اس کے لکھنے والوں میں نواب حسن یار جنگ، مرتضیٰ مجتہدی، معین الدین کولاس، ولی اللہ بخاری، عبدالرحمٰن خاں اور میر عابد علی خاں شامل ہیں۔ صفحہ (۴) پر بزم اقبال کی مصروفیات" کے عنوان سے بزم اقبال کے ایک کاروباری اجلاس کی روداد اور ہفتہ اقبال کی مصروفیات کی تفصیل شائع کی گئی ہے اس کے چند دلچسپ حصے ملاحظہ ہوں۔

۱۷ خورداد ۱۳۵۲ف (۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء)

آج صبح دس بجے صدر بزم اقبال نواب حسن یار جنگ بہادر کی دولت سرا پر "ہفتہ اقبال" کی مجلس انتظامی کا ایک اہم جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت

---

[۱] ملاحظہ ہو "اقبال" از عطیہ بیگم شائع کردہ اکیڈمی آف اسلام فروری ۱۹۴۷ء (دھکڑی پرنٹنگ پریس بمبئی)

[۲] اقبال کے اس اقبال نمبر کو ہم نے نواب حسن یار جنگ کی اجازت سے اقبال اکیڈمی پاکستان کی نذر کر دیا ہے۔

نواب[1] سرجہدی یار جنگ بہادر صدر مجلس استقبالیہ نے کی۔ اس جلسہ میں ارکان استقبالیہ میں سے مولوی میرنجف علی خاں صاحب ناظم معلومات عامہ (ڈائرکٹر انفارمیشن) مولوی قاضی زین العابدین صاحب ناظم آبکاری (اکسائز کمشنر) مولوی عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات (کمشنر فارسٹ ڈیپارٹمنٹ) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب صدر شعبہ عمرانیات جامعہ عثمانیہ، خان بہادر سید احمد صاحب پرنسپل مدرسہ مرکزی فنونِ لطیفہ، مسٹر سرمست خاں آزاد ایڈیٹر اخبار اقبال، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب رناظم آثار قدیمہ غلام دستگیر رشید، مسٹر راماچاری وکیل ہائیکورٹ ...... وغیرہ کے علاوہ چند اور مدعوئین نے بھی شرکت کی ...... چونکہ آج ہی یوم پرچم بھی تھا۔ اس لیئے مولوی نجف علی خاں صاحب صدر شعبۂ پرچم "ہفتۂ اقبال" کی درخواست پر نواب سرجہدی یار جنگ بہادر نے فروخت پرچم کا افتتاح کیا۔ اور اس سلسلے میں آپ نے مبلغ ایک سو روپے بھی عطا فرمائے۔ بیٹھے ہوئے شرکائے اجلاس میں ایک آنہ کی قیمت پر زرد و سبز رنگ کے پرچم فروخت کیئے گئے۔ جس کو حاضرین نے اپنے سینوں پر لگا کر اقبال سے عقیدت اور اس کی قدر افزائی کا زندہ ثبوت پیش کیا۔ تقسیم پرچم کے بعد ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے قاضی نذرالاسلام سے متعلق ایک تحریک پیش کی جس کا حوصلہ افزا خیر مقدم کیا گیا۔ تحریک یہ تھی کہ آج کے ہندوستان کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام سخت بیمار ہیں اور ان کی غربت کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس دوا دارو تک کے لیئے پیسے نہیں۔ ایسے نازک وقت

---

[1] سرجہدی یار جنگ اقبال کے قدیم دوست سید علی بلگرامی کے بھتیجے اور اس وقت حیدرآباد کے وزیر تعلیمات تھے۔

میں بزمِ اقبال کی جانب سے حیدر آباد کے شایانِ شان ایک معتد بہ رقم ان کی فوری امداد کے لئے روانہ کی جائے اور پرچم کی فروخت کے سلسلے میں حاصل شدہ سرمایہ اس امداد کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ یہ دلچسپ پروگرام تقریباً ایک بجے ختم ہوا۔ اور نماز جمعہ کے بعد مسجد افضل گنج میں بزمِ اقبال کی جانب سے علامہ اقبال کے لئے مجلسِ ایصالِ ثواب کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اور اس کے بعد شہر کے مرکزی مقامات اور مختلف محلوں میں نواب سر مہدی یار جنگ بہادر، نواب حسن یار جنگ بہادر، مولوی نجف علی خاں صاحب، مولوی قاضی زین العابدین صاحب، خان بہادر سید احمد صاحب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب .... وغیرہ نے یوم ہفتۂ اقبال کا پہلا دن پھوٹے پرچم کی فروخت کرکے منایا۔ شام کے چھ بجے کے بعد سے جدھر دیکھو ان پرچموں پر مطبوعہ ہلال و تارے راہگیروں کو ایک دوسرے کی طرف متوجہ کر رہے تھے اور ملک کا ہر شخص آج اقبال کے تصور میں کھویا ہوا جھوم رہا تھا۔ بالخصوص پرچم کے ایک طرف چھپا تھا یہ شعر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

ہر اس نوجوان کو جس کے سینے پر پرچم پیوست تھا اقبال کی اس دیدہ وری سے اکتسابِ نور کا موقع دے رہا تھا اسی شام کو نواب سر مہدی یار جنگ بہادر نے انگریزی اور نواب حسن یار جنگ بہادر نے اردو میں یوم پرچم کے عنوان پر دکن ریڈیو سے تقریریں نشر کیں۔

۲۱ر خور داد ۱۳۵۳ھ ف

آج شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پر صرف تشہیری پردے لگادیے گئے۔

۲۲ خورداد ۱۳۵۳ھ ف

"ٹاؤن ہال باغ عامہ کے مقابل والے چمن میں آج شامیانے نصب کئے گئے۔ دفتر استقبالیہ کو ٹاؤن ہال میں منتقل کیا گیا۔ مہمانوں اور مندوبین کے نام دعوت نامے جاری ہوئے۔

۲۳ر خورداد ۱۳۵۳ھ ف

آج ٹاؤن ہال باغ عامہ گوناگون دلکشیوں کا حامل بن گیا ہے۔ ملک کے سرگرم نوجوان ٹاؤن ہال کی آرائش اور تزئین و زینت میں اضافہ کرنے کے لئے بیش از بیش حصہ لے رہے ہیں۔ دفتر استقبالیہ آنے جانے والوں کے استفسارات کے جواب، دعوت ناموں کی تقسیم اور آئندہ جلسوں کے پروگرام کی ترتیب میں اتنا منہمک ہے کہ اسے سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ دکن ریڈیو کی طرف سے ایک چھوٹی سی نشر گاہ اور اس کے آلات اسٹیج کے قریب اور اس کے متصلہ کمرے میں نصب کردیئے گئے۔ ...... ٹاؤن ہال کے اس بلند مقام پر جہاں صدر اور معزز مہمانوں کی نشستیں سجائی گئی ہیں، ایک خوبصورت فرش کو ایران کے قیمتی اور دبیز قالین سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اسٹیج سے بالکل سامنے کی دیوار کے حریری پردے پر علامہ اقبال کی بہت بڑی تصویر آویزاں کی گئی ہے جو ٹاؤن ہال میں بیٹھے ہوئے آخری شخص تک کو اپنے رعب اور باوقار حسن کاری کی طرف خود بخود متوجہ کرلیتی ہے۔ اُدھر ٹاؤن ہال کے بالائی حصہ میں آرٹ گیلری بھی ترتیب دی گئی ہے جس میں علامہ اقبال کے کئی ایک مشہور شعر تصویروں کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں۔ ..... اس

تصویر خانہ میں پہنچ کر ہر شخص تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ جہاں اقبال کی شاعری سراپا زندگی بن کر دعوتِ عمل دینے لگتی ہے:

اخبار اقبال جلد (۸) نمبر (۲۱) روز جمعہ ۱۲ رمئی ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں ہفتہ اقبال کے پہلے اجلاس کا خطبۂ صدارت شائع کیا گیا ہے یہ خطبہ نواب حسن یار جنگ صدرِ بزم اقبال کا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر و اراکین بزم اقبال نے پیام و کلام اقبال کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں کیا پروگرام بنایا تھا۔ خطبۂ صدارت دیتے ہوئے صدر بزم اقبال نے کہا تھا۔

"اس موقع پر میں ایک اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بزم کی تحریک پر ایک "اقبال میموریل کمیٹی" کی تشکیل عمل میں آچکی ہے جس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر نے قبول فرمائی ہے۔ اس کمیٹی نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا ہے کہ دار السلطنت حیدرآباد کے ایک موزوں مقام پر ایک "اقبال میموریل" یا "اقبال اکیڈمی" قائم کرے۔ یہ اکیڈمی ایک موزوں ہال، دار المطالعہ اور دفتر کی شکل میں ہوگی ...... بزم اقبال نے ایک اور اہم کام اپنے ذمہ لیا ہے وہ "اقبال انسائیکلوپیڈیا" کی ترتیب ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی تصانیف میں بعض ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں جن کا ان کے کلام اور مضمون سے خاص تعلق ہے۔ عامۃ الناس کو علامہ اقبال کے کلام کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد دینے کے لئے یہ ایک اہم کام ہوگا۔"

اراکین بزمِ اقبال کے یہی عزائم تھے جو ان کو یومِ اقبال کی رسم ادا کرنے کی بجائے اپنے ماہانہ اجتماعات کے علاوہ ہر سال "ہفتہ اقبال" کو پُر جوش اور پُر عظمت طریقہ سے منانے پر اکساتے تھے ہفتہ بھر کا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا جاتا تھا کہ ہر دوسرا دن زیادہ دلچسپیوں کی نوید دے کر

ل اسے بھی اقبال اکیڈمی میں نواب حسن یار جنگ کی اجازت سے داخل کر دیا گیا ہے۔

آتا تھا۔ ان اجتماعات کا اختتام کل ہند اور کبھی مقامی شعرا کے تعاون سے مشاعرہ پر ہوتا تھا اس زمانے میں حیدرآباد کے تمام اردو اور انگریزی اخبارات "اقبال نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ بزم اقبال کی طرف سے ہر سال اقبال پر مضامین کا انعامی مقابلہ منعقد کیا جاتا تھا اور اہل قلم خواتین کے لئے بھی علیحدہ انعام کا اعلان کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے یوم اقبال کی روداد روزنامہ "رہبر دکن" نے شائع کی ہے[1]۔ اس میں انعامات کی تفصیل بھی دی ہے۔ یہ جلسہ بھی ایک نوعیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا افتتاح نظام دکن کے چھوٹے بھائی نواب بسالت جاہ نے کیا تھا اور صدارت پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم نے کی تھی۔ غلام محمد صاحب کی پُر مغز اور دلچسپ تقریر کی یاد آج بھی ہم میں سے بہت سوں کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ انعامات کی تفصیل "رہبر دکن" نے اس طرح دی ہے۔

صاحبزادہ ممدوح الشان نواب بسالت جاہ بہادر نے انعامی مقابلہ بزم اقبال ۱۳۵۵ف ۱۹۲۳ء کے انعامات تقسیم فرمائے۔ انعام اول نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ "اقبال اور ان کی حیات" کے مقالے پر سید محمد یوسف ناظم بی اے عثمانیہ کو عطا ہوا ..... انعام دوم نواب حسن یار جنگ بہادر (آزادیٔ نسواں اقبال کی نظر میں) کے مقالہ پر فخر الحسن ایم اے کو عطا فرمایا گیا۔ انعام سوم "ماہ ملت" (اقبال کی شاعری) کے مقالے پر حکیم سید علی صابری کریمنگری کو اور انعام چہارم نواب دوست محمد خاں صاحب (اقبال کا پیغام عمل) کے مقالہ پر عبدالکریم صاحب ماہر کو عطا ہوا۔ مولوی میر اکبر علی خاں بیرسٹر کا انعام بھی اول انعام یافتہ کو عطا ہوا۔

---

[1] رہبر دکن کا یہ شمارہ بھی ہم نے نواب حسن یار جنگ کی اجازت سے اقبال اکیڈمی پاکستان کی نذر کر دیا ہے۔

اقبال کے متعلق مقالوں کے ان انعامی مقابلوں میں حیدر آباد کے ادیبوں اور طلباء کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے ادیب اور طلباء بھی حصہ لیتے تھے چنانچہ یوم اقبال کے معتمد استقبالیہ کے ایک اعلان کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اس کام کی وسعت کا اندازہ ہو سکے (یہ اعلان ہم کو حیدر آباد کے مختلف اخبارات کے ان تراشوں میں ملا ہے جو نواب حسن یار جنگ کی کراچی کی گھریلو لائبریری میں ایک دبیز رجسٹر میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ تراشے نامکمل ہیں اور ان میں "بزم اقبال" کی دس سالہ کارروائیوں کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں، لیکن ان میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۲ء کے جلسوں کی سیر ٹوٹتے ہوئے دل کے ساتھ کی جا سکتی ہے)

اعلان ملاحظہ فرمایئے۔

"معتمد صاحب استقبالیہ "یوم اقبال" کا ایک اعلامیہ مظہر ہے کہ گذشتہ سال بزم اقبال کی جانب سے انعامی مقابلوں کے اعلان پر ملک کے ادیبوں، جامعہ عثمانیہ کے طلباء و طالبات کے علاوہ ہندوستان کے اصحاب نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔ ہندوستان کی جامعات سے بھی خواہش کی گئی تھی کہ وہ اپنے طلباء سے علامہ اقبال پر مقالے لکھوا کر بزم کو روانہ فرمائیں اس ضمن میں ارباب جامعات نے بزم سے تعاون کیا۔ اپنے طلبہ کے تحقیقی مقالے بھجوائے تھے۔ ان مقالوں کی پوری تعداد جو بزم کو وصول ہوئے ہیں (۵۶) ہے۔ جن میں سے (۲۷) مقالے خواتین کے ہیں۔ دبیرِ دکن ۳۰ خورداد ۱۳۵۲ف (مطابق ۹ اپریل ۱۹۴۳ء)

کہاں تک بیان کیا جائے، داستان دراز ہے اور کراچی میں مواد کی کمی، جو کچھ اوپر لکھا گیا وہ "بزم اقبال" کی کارپردازی کی تفصیل نہیں بلکہ خاکہ ہے اور خطبات اور اخباری تراشوں کے حوالوں کے سلسلہ اس لئے پیش کیا گیا کہ اہل حیدر آباد جس خلوص عقیدت اور ٹھوس بنیادوں پر اقبال پر کام کر رہے تھے اس کی تصویر مکمل طور پر سامنے آجائے۔

حلقۂ درسِ اقبال اس کے بانی اقبال کے رمز شناس شیدائی نواب بہادر یار جنگ تھے۔

ہر جمعہ کو شام کے چار بجے (جمعہ حیدرآباد میں ہفتہ وار چھٹی کا دن ہوتا تھا) بہادر یار جنگ کے "بیت الامت" کے وسیع و آراستہ دیوان خانے میں درس دینے اور درس لینے والے اقبالین کا اجتماع بالالتزام ہوتا تھا۔ اس حلقہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد کے اہلِ علم کم از کم ہفتہ میں ایک بار یک جا ہوں اور اپنے ذوقِ ادب کی تسکین کا سامان فراہم کریں اور کلامِ اقبال کے رموز تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ درس کی ابتدا اقبال کی پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" سے کی گئی۔ پروگرام یہ تھا کہ جس ترتیب سے اقبال کا کلام شائع ہوا ہے اسی ترتیب سے درس بھی جاری رہے۔ بالکلیہ علمی ماحول کی وجہ سے شرکا کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ دو چار بار ہمیں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہوتا یہ تھا کہ پروفیسر غلام دستگیر رشید ایک شعر پڑھتے اور اس پر سلسلہ وار بحث کی جاتی۔ اشعار کی تشریح و توضیح میں حصہ لینے والوں میں رشید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور خود نواب بہادر یار جنگ نمایاں رہتے تھے۔ بعض اوقات ایک ایک شعر پر اتنی دل چسپ، معلومات آفریں اور طویل گفتگو ہوتی تھی کہ دو گھنٹے پلک جھپکتے میں گذر جاتے اور ایک تجسس آمیز کیفیت میں محفل برخواست ہو جاتی تھی۔ درس کا یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ اور غالباً "اسرارِ خودی" نصف ختم ہوئی تھی کہ اچانک نواب بہادر یار جنگ کی وفات بلکہ یوں کہئے کہ شہادت کا حادثہ

[۱، ۲، ۳] ان سب حضرات کا تفصیلی تعارف آپ اگلے ابواب میں پڑھیں گے۔

پیش آگیا اور یہ یادگار مجلس برہم ہوگئی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!

بہادر یار جنگ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ غلام دستگیر رشید اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اور نواب صاحب کی یادگار کے طور پر کچھ عرصہ تک جاری رہا پھر ختم کر دیا گیا۔
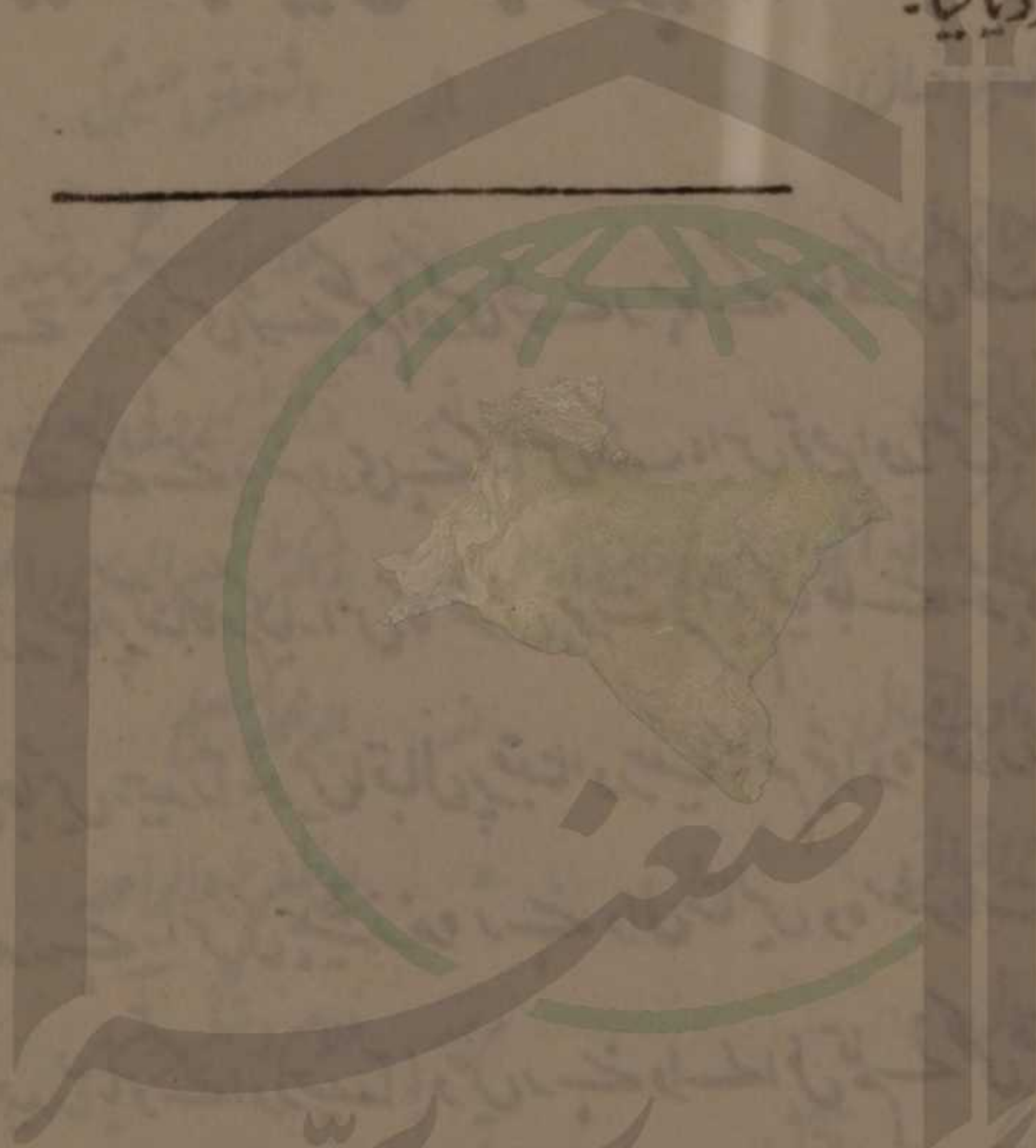
حیدرآباد میں اقبال پر مطبوعات

کسی بڑے [illegible]ر، کسی بڑے حکیم اور کسی بڑے رہنما کے ساتھ کسی ملک، کسی قوم اور کسی جماعت کا ربط واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس ملک، اس قوم اور اس جماعت نے اس بڑے شاعر، حکیم اور رہنما پر کتنا کام کیا۔ اس کا ٹھوس ثبوت فراہم کیا جائے۔ ذہنی تغیرات کی روشن مثالیں پیش کی جائیں۔ حیدرآباد میں اقبال پر جتنا اور جیسا کام ہوا وہ مقدار، وزن اور کیفیت میں بہت گراں قدر ہے۔ اس کی ہمیشہ زندہ رہنے والی مثالیں وہ مطبوعات ہیں جو تقسیم ملک سے بہت پہلے حیدرآباد کے اور حیدرآباد میں رہنے والے اہل قلم نے لکھی تھیں۔ اس ذخیرہ میں تالیفات کے علاوہ مستقل تصانیف بھی ہیں اور منتشر مضامین بھی، مرتبین اور مصنفین کی صف میں مشہور انشاء پرداز، اساتذہ اور طالب علم نظر آتے ہیں۔ میخانۂ اقبال سے سبھی نے بقدر ظرف اپنے اپنے پیمانے بھرے ہیں پی ہے۔ تشنہ کامی ہے اور ایک عالم کو اس سرور سرمدی سے آشنا کیا ہے جو اقبال کی روح میں موجزن رہا ہے۔ ان روشن ضمیر قدح خواروں کے سامان کیف و سرور پر نظر ڈالنے سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ سبھوں نے اقبال کی زبان میں اقبال سے یہی التجا کی ہے کہ

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

سب سے پہلے ہم آپ کی خدمت میں ان مطبوعات کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

(۱) روحِ اقبال — از ڈاکٹر یوسف حسین خاں

(۲) اقبال کا تصورِ زمان و مکان — " ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

(۳) شاد و اقبال — مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

(۴) اقبال — " ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۵) مقامِ اقبال — از اشفاق حسین

(۶) آثارِ اقبال — مرتبہ غلام دستگیر رشید

(۷) رموزِ اقبال — از ڈاکٹر میر ولی الدین

(۸) اقبال کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی — " ڈاکٹر ظہیر الدین (الجامعی)

(۹) قرآن اور اقبال — از ابو محمد مصلح

(۱۰) متاعِ اقبال — " ابو ظفر عبدالواحد

(۱۱) ذکرِ اقبال — مرتبہ غلام دستگیر رشید

(۱۲) اقبال ایک جدید تشکیل — از عزیز احمد

(۱۳) فلسفۂ عجم — مترجمہ میر حسن الدین

(۱۴) ترجمۂ خطبات — " "

(۱۵) حکمتِ اقبال — مرتبہ غلام دستگیر رشید

(۱۶) اقبال (فن اور فکر، انگریزی) — از ایس۔ اے۔ واحد

(۱۷) کلیاتِ اقبال — مرتبہ عبدالرزاق راشد

(۱۸) اقبال کا سیاسی کارنامہ — از محمد احمد خاں

(۱۹) نظمِ اقبال، سفرِ حیدرآباد دکن — مرتبہ — تصدق حسین تاجؔ

(۲۰) مرقعِ اقبال — مرتبہ — بزمِ اقبال

(۲۱) الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال — " — حسن الاعظمی

(۲۲) اقبال پر فارسی میں رسالہ — از — داعی اسلام آغائے محمد علی

(۲۳) سب رس کا اقبال نمبر — مرتبہ — خواجہ حمید الدین شاہد و صاحبزادہ میکش

مطبوعات پر گفتگو کا آغاز ہم سلسلۂ اقبالیات کی اہم ترین کتاب "روحِ اقبال" سے کرتے ہیں۔ "روحِ اقبال" کی ترتیب و تدوین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں[1] دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اقبال کے خیالات کو اپنے مطالعہ کی سہولت کے مدنظر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) آرٹ (۲) تمدن (۳) مذہب۔ ان تینوں شقوں کے تحت زندگی اور کائنات کے تمام اہم مسائل آجاتے ہیں جن کی نسبت اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

ہم بھی اسی ترتیب سے "روحِ اقبال" کا مطالعہ کریں گے۔ آرٹ کا لفظ تمام فنونِ لطیفہ پر محیط ہے۔ ہر جذبہ اور ہر آواز میں نغمہ کا آہنگ نہیں پیدا ہوتا۔ مصوّر کا ہر خیال تصویر نہیں بن جاتا اور شاعر کا ہر مشاہدہ و تخیئل شعر کا جامہ نہیں پہن لیتا۔ بلکہ ہر جذبہ، ہر خیال اور ہر ایک مشاہدہ تخیّل کو سینکڑوں خزاں طے کرنے پڑتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور خونِ جگر کا یہ التہاب اور جوش ودیعتِ فطرت ہوتا ہے اس کی ارزانی ممکن ہی نہیں۔

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا شمار اردو زبان کے بڑے نقادوں میں ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں تاریخ و سیاسیات کے پروفیسر رہے۔ آج کل علی گڑھ [illegible]ٹی کے پرو وائس چانسلر ہیں۔ [2] روحِ اقبال

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

سب سے پہلی اور ضروری بات تو یہ ہے کہ آرٹسٹ "دلِ گداختہ" سے بہرہ مند ہو اور پھر اسے اپنے فن کی "شاطگی" کا وہ سلیقہ میسّر آئے کہ آواز نغمہ بن جائے، تو قلم کی ہر جنبش تصویر کے رنگ و خطوط میں زندگی اور حسن کی روح بھر دے اور جذبہ شعر کے جامہ میں سحر کی صورت اختیار کرلے!

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو!

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب کے اس حصہ میں آرٹسٹ کی تعریف یہ کی ہے۔

"آرٹسٹ کی بدولت فطرت کے بھی طومار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ آرٹسٹ کی زندگی دو دنیاؤں میں بسر ہوتی ہے ایک اس کے تخیّل کی دنیا اور ایک خارجی عالم فطرت۔ ...... اصل آرٹسٹ خارجی عالم کی چمکدار سطح کی نقالی کو اپنے لئے ننگ سمجھتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ اس کی پر اسرار روح کو جذب کرنا چاہتا ہے۔ فطرت نقل کے لئے نہیں ہے بلکہ توجیہ کے لئے۔ کائنات اظہار و توجیہ کی منتظر ہے۔"[1]

اور ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:-

"اقبال کی شاعری متین روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے ہے۔ وہ اپنے سامع کے دل میں جذب و قوت کی ایسی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کے ذریعہ وہ فطرت پر قابو پا سکے۔ اس کے آرٹ کے دو محرک خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک تو انسانی زندگی کے

---

[1] روحِ اقبال ص ۲۰، ۲۹ [2] روحِ اقبال ص ۲۳

لامحدود امکانات کا عقیدہ اور دوسرے نفسِ انسانی کی کائنات میں قومیت، بالعموم ایسا ادب جو کسی خاص غرض کے حصول کا ذریعہ ہو، خشک، بے کیف اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے پست ہو جاتا ہے لیکن اقبال نے اپنے مطالب کو اس سلیقے سے رنگ آب و شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ وہ دل و نظر کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں۔[1]

اسی باب میں اس سے پہلے انہوں نے لکھا تھا

"اقبالؔ نے مختلف موقعوں پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ اس نے اپنی قوم سے شکایت کی ہے کہ

اُو حدیثِ دلبری خواہد زمن
رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیِ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید

اس سے در اصل مراد یہ ہے کہ وہ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں برتتا، بلکہ اس کو اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کا ذریعہ تصور کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را"

مذکورہ حوالہ جات پر بحث کرنے سے پہلے ہم عاشق بٹالوی کی ایک روایت کو یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے۔[2]

ایک روز محشوؔ لدولی کی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ

---

[1] روحِ اقبال صہ ۱۹ [2] آثارِ اقبال صہ ۲۷، ۲۸

اب دلی لکھنؤ سے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں، جن کے دم سے اردو شاعری کے ان دو دبستانوں کی خصوصیات قائم تھیں، اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنؤ، دلی، لاہور حیدرآباد سب ایک سطح پر آجائیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بے شک آپ صحیح کہتے ہیں، بہت سے لوگ تو رخصت ہو چکے اور جو باقی ہیں وہ بھی اٹھتے جاتے ہیں۔ میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید زندہ تھے لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں، مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب و انقباض اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اظہار ہو رہا تھا، کبھی ان کی بھویں تنتی اور پھیل جاتی تھیں۔ کبھی آنکھیں ایکبارگی کھلتی اور بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے، جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا۔ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی لیکن جو کچھ عرض کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا؟

انہوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا:۔ ہاں صاحب سنا ہے لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو ہم نے آج تک پڑھی ہے نہ سنی ہے حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔

ڈاکٹر صاحب یہ لطیفہ بیان کر کے دیر تک ہنستے رہے۔"

کہنے سننے کے لئے یہ ایک لطیفہ ہے لیکن اقبال کے شاعرانہ ذہن کی تعمیر میں ایسے کتنے لطیفوں اور واقعات کا دخل رہا ہوگا۔ اقبال ایک عظیم شاعر تھا اس لئے وہ اپنے مقام اور اپنے خاص متین لہجے میں زبان و بیان کے روایت پرستوں پر "حدیث دلبری" اور رنگ و آب شاعری جیسی خوب صورت ترکیبوں کے پردے میں طنز کر کے رہ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شاعری کو "اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ" سمجھتا تھا۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

لیکن دنیا کا وہ کونسا آرٹسٹ ہے جس نے کسی نہ کسی آرٹ کو "اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ" نہ بنایا ہو لیکن بڑے آرٹسٹ کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے ذریعۂ اظہار کو اتنا حسین بنا کر پیش کرتا اور اس کی نوک پلک کو اس طرح درست رکھتا ہے کہ اہل نظر نظیری کے ہم زبان ہو کر کہہ اٹھتے ہیں

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی عام نقادوں کی طرح آرٹسٹ اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے لیکن خود اس کے آرٹ کا دائمی پہلو اجاگر نہیں کر سکے ہیں۔ اگرچہ اس تجزیہ کے سلسلہ میں انہوں نے ایک پرانی بحث "فن برائے فن" اور "فن برائے زندگی" کو ضرور تازہ کیا ہے۔ طویل نقد و نظر کے باوجود یہ مسئلہ تشنہ رہ گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی اور لوگوں کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفی اور مدبر اقبال سب کچھ ہے اور اس کی شاعری "ذریعہ ہے اپنے مقاصد کے حصول کا"۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ اقبال اپنے مقاصد کی جلالت اور تقدس اور فلسفہ و حکمت کی اہمیت کے باوجود اول و آخر شاعر ہیں اس لئے کہ ان کی حکمت اور فلسفہ اور ان کے سیاسی تدبر کا حاصل ہیں ان کی نثری مطبوعات اور خطبات میں کما حقہٗ نہیں ملتا، بلکہ ان کی ساری شخصیت ان کے بلند آہنگ شعروں

میں پوشیدہ ہے اور ان کی شاعری نے فن کی تمام بلندیاں کو طے کر کے قومی مقاصد اور دنیوی مسائل کو اپنے اندر سمویا ہے۔

ع مری نوائے پریشان کو شاعری نہ سمجھ یا

ع نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست یا

ع مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو

اسے شاعر کا اندازِ بیان سمجھنا چاہیے ایک حسین تعلی، ایک لطیف پیرایۂ طنز، اگر حسن معنی کو اقبال کی شاطگی نہ میسر آتی تو شاید اردو شاعری میں اتنا بڑا انقلاب نہ آتا اور قومی مقاصد اور عمیق مسائل شعروں کے پاکیزہ روپ میں ضرب المثل نہ بن سکتے اور یہ کام بغیر "سلیقے" اور بغیر ادراکِ فن کے ممکن ہی نہیں، یہی "سلیقہ" اور ادراکِ فن ہے جس نے اقبال کو لازوال کر دیا ہے اور ہم نے اس کے کلام کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے!

اے کہ زمن فزودۂ گرمیٔ آہ و نالہ را

زندہ کن از صدائے من خاک ہزار سالہ را

اس مختصر سی سخن گسترانہ بحث کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس باب کے ذیلی عنوانات "خلوص اور شعر"، "شاعر اور عالم فطرت"، "جذبۂ عشق اور تسخیر فطرت"، "عشق و عقل" اور "اقبال کا شاعرانہ مسلک" وغیرہ پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بڑی محنت کی ہے اور نہایت شگفتہ طرزِ تحریر میں بڑی بلیغ باتیں لکھی ہیں، یہ باتیں اقبال پر کام کرنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کرتی رہیں گی

"روحِ اقبال" کے دوسرے باب کا عنوان ہے "اقبال کا فلسفۂ تمدن" اور یہ حصہ حسبِ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے۔

"مقاصد آفرینی"، "عمل اور اخلاق"، "قصۂ آدم"، "تاریخی استقراء"، "انسان کامل"۔ "حیاتِ

اجتماعی" "فرد اور جماعت" "مملکت اور تمدن" اور "نظامِ معاشری" تقریباً ایک سو اسی صفحات پر پھیلی ہوئی یہ مدلل بحث و گفتگو ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے عمیق مطالعے اور فکرِ اقبال سے ان کی گہری وابستگی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ در قافلۂ، بے ہمہ شو، با ہمہ رو!

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیال ہے کہ اس ایک شعر میں اقبال نے اپنے فلسفۂ تمدن کا نچوڑ پیش کر دیا ہے چونکہ اس کا تصورِ حیات اسلامی روایات پر مبنی ہے اور یہ روایات وہی ہیں جن میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے اور ان کے ظاہری تضاد کو بھی دور کر دیا گیا ہے۔ انسانی تمدن میں یہ مسئلہ ہمیشہ پیچیدہ رہا ہے کہ فرد اور جماعت کی نوعیت کیا ہو؟ کیا فرد کو اپنی انفرادیت جماعت میں ضم کر دینی چاہیئے؟ کیا فرد اور جماعت کے مقاصد میں دائمی تضاد ہے؟ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت کے اس راز کو اقبال نے اپنے صحیح وجدان سے پا لیا کہ وہی تمدن فطرت کے موافق ہو گا جس میں انفرادی خودی کو اپنی "نگہداری" کا موقع ملے اور "انجمن آرائی" کا بھی سلسلہ جاری رہے!

"روحِ اقبال" کا تیسرا اور آخری حصہ اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعیٔ تصورات کے بارے میں ہے اور تقریباً سوا سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ بلاشبہ اس حصہ کو "روحِ اقبال" کی روح کہا جا سکتا ہے اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فکرِ اقبال کے بنیادی محرکات کو بہت سادہ طرز ادا میں عام فہم بنا دیا ہے اور ان کے سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک نیا زاویہ نظر مل جاتا ہے

"رموزِ اقبال" ۔ اس کے مصنف ڈاکٹر میر ولی الدین ہیں۔ اس کتاب کو حیدر آباد

؎ ڈاکٹر میر ولی الدین قدیم و جدید علوم فلسفہ کے ماہر و نباض سمجھے جاتے ہیں۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

کے ادارۂ نشریاتِ اردو نے شائع کیا تھا۔ اس کے ایک سو اسی صفحات میں کیا "اسرارِ اور رموز" بند ہیں اس سوال کا جواب ہمیں خود ڈاکٹر میر ولی الدین کی تحریر کردہ تمہید میں مل جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

" اقبالؒ، "دانائے راز" سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہدِ حاضر کی تہذیب نے انسانوں کی ذہنیت میں کیا انقلاب پیدا کر دیا ہے؟ تصورات، نظریات، عقائد، اقوال و اعمال میں کیا تغیر پیدا ہو گیا؟ مسلمان کی زندگی اصل میں کیا ہے، اس کے عقائد کیا ہیں؟ اور اعمال کی نوعیت کیا؟ عقل و عشق کا اس کی زندگی میں مقام کیا ہے؟ اس کے علم کی بنیاد کیا ہے اور ایمان پر اس کے اعمال کا انحصار کس حد تک ہے؟ قرآن کریم نے اس کی خودی کا اس کو کیا علم بخشا ہے؟ خودی کے عرفان کے بعد مسلمان میں کیا تغیر پیدا ہوتا ہے؟ یقین اور عمل کے لحاظ سے کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے؟ اپنی حقیقت و ماہیت سے واقف ہو کر انسان کے نقطۂ نظر میں کیا تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے؟ خود کو نقیرِ امین اور خلیفہ جان کر انسان کس طرح آفاق کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور کائنات کو مسخر کر لیتا ہے؟

انہی سوالات کے جواب آپ کو پیشِ نظر کتاب میں ملیں گے، اقبال کی تعلیمات کا یہ گراں قدر حصہ ہے، نگاہِ غائر سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہے اور وضاحت کے ساتھ ان کو پیش کیا گیا ہے! زمانۂ حاضر کے مکتب اور جامعات سے یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عرصہ دراز تک جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ فلسفہ کی حیثیت سے سینکڑوں تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے رہے ہیں۔ اور سنا ہے کہ اب بھی یہ سلسلۂ فیض جاری ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] رموزِ اقبال صفحہ ا۔۲۔

قرآن اور اقبال

اس کے مصنف مولانا ابو محمد مصلح[1] ہیں۔ اور ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید (حیدر آباد دکن) نے اسے ۱۳۵۹ھ میں نہایت دیدہ زیب طریقہ سے شائع کیا تھا۔ حجم ایک سو اکیانوے صفحات ہے لیکن اس کے باوجود کلام اقبال کے وہ سارے گوشے سامنے آگئے ہیں، جو کلامِ اقبال میں تعلیمات قرآن سے مخصوص ہیں۔ مولانا موصوف اپنی تحریک کے سلسلے میں اقبال سے دو بار[2] ملاقات بھی کر چکے ہیں۔ اس ملاقات کا حال انہی کی زبانی سنئے۔

"مدراس[3] کے علمی سفر سے واپسی پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم شاہی مہمان کی حیثیت سے چند روز حیدر آباد میں بھی ٹھہرے۔ میں تحریکِ قرآن کے سلسلے میں نواب نذیر[4] جنگ بہادر کے ہمراہ ملنے گیا۔ تعارف کے بعد تحریک قرآن کا اولین مقصد قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطلب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا گیا۔ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع تھا اقبال نے اپنے خاص انداز میں کہا۔

"مولوی صاحب! آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر پہلے یہ بتائیے کہ قرآن پڑھائے گا کون؟" مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا اور مجھ کمبل بدوش کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھنے لگا کیونکہ یہ کوئی معمولی معارضہ نہیں تھا۔ اور نہ کسی معمولی شخص کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے جس دن یہ کمی پوری ہو گی سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر آپ مجھے قرآن، قرآن

---

[1] مولانا ابو محمد مصلح ایک خاموش مصلح اور عامل عالم اور راہنما کی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ کے حامل ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مشہور رسالہ "ترجمان القرآن" پہلے آپ ہی کی زیر ادارت حیدر آباد سے شائع ہوتا تھا۔ [2] قرآن اور اقبال ص۱۰ [3] محسن الملک کے ایک قریبی رشتہ دار

کرنے دیجئے۔ کیونکہ آپ کے حسبِ منشاء قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور میں نے رخصت چاہی۔ دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ کچھ چھپی ہوئی چیزیں بھجوائیں اور تحریک کے متعلق رائے طلب کی۔ طالب علم نے اپنی طرف سے یہ جرأت کی کہ ان کو بھی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دی۔ انہوں نے مزاحاً کہا۔

"پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھ لوں گا۔ پھر ایسا ضرور کروں گا۔"

پھر انہوں نے تحریک پر حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا۔

قرآنی تحریک کا پروگرام مبارک ہے۔ اس زمانے میں قرآن کا علم ہندوستان سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی جائے کیا عجب ہے کہ آپ کی تحریک بارآور ہو اور مسلمانوں میں قوتِ عمل عود کر آئے۔

مخلص اقبال

مولانا نے اقبال سے اپنی دوسری ملاقات کا حال اس طرح سنایا۔

"میں قرآن مجید معہ بچوں کی تفسیر[1] کی کتابت و طباعت کے سلسلہ میں کچھ مدت کے لئے لاہور گیا۔ ایک دن ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی ملنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی تھے۔ عصر کی نماز وہیں ادا کی، چائے نوشی کی بھی نوبت آئی۔ اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ علالت کا سلسلہ جاری تھا مگر اتنا نہیں کہ معذوری ہو چکی ہو۔ سب سے پہلے تحریکِ قرآن کی رفتار کے متعلق استفسار کیا پھر لاہور آنے کی غرض دریافت کی اپنے بچوں کے لئے چھپے ہوئے پارے چغتائی صاحب کے ذریعہ بھیج

[1] قرآن اور اقبال

دینے کو کہا۔ حیدرآبادی سیاست کے بعد پنڈت جواہرلال نہرو کے "اسلامی کلچر" پر خیال

آرائی کا بھی ذکر آیا، اقبال نے جو اس کا جواب دیا تھا، میں نے اس کی تحسین کی، مولوی

عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے دہلی منتقل کرنے والے تھے، اقبال

نے اپنا خیال ظاہر کیا اس کے لئے موزوں مقام لاہور ہے۔ اسلام میں عورتوں کی حیثیت

کا ذکر چھڑا تو اقبال نے کہا "مجھ سے ایک دن ایک امریکن لیڈی ملنے آئی اور اس نے

شکایۃً کہا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اس پر اس کو ایسا مسکت

جواب دیا گیا کہ وہ قائل ہو گئی" اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ "دنیا میں صرف ایک ہی

ذات ایسی ہوئی ہے، جس نے عورت کی فطرت کو کامل طور پر پہچانا اور وہ ذات گرامی

محمد عربی صلعم (فداہ ابی و امی) کی تھی۔ دیکھا گیا ہے کہ حضور کا نام مبارک آتے ہی اقبال

کا دل بھر آیا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں۔

مولانا ابو محمد مصلح کی اقبال سے ملاقاتوں کی تفصیل یہاں اس لئے پیش کی گئی ہے کہ قرآن

اور اقبال کے مصنف کا انداز کار واضح ہو جائے اور منشائے ذکر اقبال سے اس کا ربط اور ذات اقبال

سے اس کا خلوص نمایاں ہو۔

"قرآن اور اقبال" کی ترتیب تین عنوانات کے تحت کی گئی ہے، "اقبال بحیثیت شاعر کے"۔

حصہ نثر" اور "حصہ نظم" ان تینوں ابواب میں ذکر اقبال کا نچوڑ جمع کر دیا گیا ہے، جو قرآن کی روشنی

میں تعلیمات اقبال کے مقاصد کو اجاگر کرتا ہے۔

آثار اقبال

اقبال پر بعض مشہور اہل قلم کے مقالات و مضامین کا یہ مجموعہ پروفیسر غلام دستگیر رشید نے[1]

---

[1] غلام دستگیر رشید نظام کالج کے لکچرار اور جامعہ عثمانیہ کے مشہور فرزندوں میں سے ہیں۔ نہایت خاموش علمی کارکن (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

مرتب کیا۔ اور اسے ادارہ اشاعتِ اردو (حیدر آباد دکن) نے ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء میں شائع کیا تھا۔ انیس[۱۹] مضامین کا یہ مجموعہ تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور بعض نہایت اہم اہلِ قلم شخصیتوں اور گوناگوں عنوانات کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بہادر یار جنگ کی ایک ناتمام تقریر اور مولانا محمد علیؒ کے ایک نایاب مضمون کے علاوہ مقالہ نگاروں میں اسلم جیراجپوری، رشید احمد صدیقی، پروفیسر مجیب، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالقادر سروری، حامد علیخاں، اور ڈاکٹر ولی الدین وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں اس مجموعہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خود اقبال کے لکھے ہوئے دو مضامین "اقبال اور معاشیات"[۱] اور "محفل میلاد النبیؐ اور اقبال"[۲] بھی شریک ہیں۔

بہادر یار جنگ کی ناتمام تقریر آپ اسی کتاب کے حصہ دوم میں پڑھیں گے۔ مولانا محمد علی کی ذاتِ گرامی مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ میں ایک عظیم رہنما کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس عظیم رہنما کے ذہن پر اقبال کے پیام و کلام نے کیا اثر ڈالا۔ اس کی تفصیل مولانا محمد علی کے مضمون "تعلیماتِ اقبال" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مضمون اصل میں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" پر مولانا کا تبصرہ ہے جو یقیناً "کامریڈ" میں شائع ہوا ہوگا۔ احمد اللہ خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ جو شگفتہ اور رواں ہے۔ "آثارِ اقبال" کے مرتب غلام دستگیر رشید کا مضمون "اقبال در حضورِ آدم" بھی بہت طویل ہے اور اہم ہے۔

"آثارِ اقبال" کے مطالعہ میں ایک بات بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ہے حوالہ جات کا عدمِ اندراج اور جو مضامین اس میں یکجا کئے گئے ہیں کہاں اور کس رسالہ سے حاصل کئے ہیں۔ اس بارے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) استاد اور طالب علم اور بہادر یار جنگ کے حلقۂ درسِ اقبال کے ایک اہم رکن، اقبال پر بہت لکھا، لکھایا ہے اور پڑھایا ہے اور اسے اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں (حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اقبال کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد کا دیباچہ ہے ۲؎ محفلِ میلاد کے متعلق اقبال کے خیالات کو اخبار زمیندار سے نقل کیا گیا ہے

بھی ناشر اور مرتب نے کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال اس کتاب کی افادیت سے انکار مشکل ہے!

اقبال کا سیاسی کارنامہ

اس کتاب کا نام ہی چونکا دینے والا ہے، شاعر اور سیاست کچھ اَن میل بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے اور بظاہر بڑی دلکش اور فنی اور شعری استغراق کے اظہار کی دلیلِ محکم! لیکن غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ اس قسم کے خیال کو کسی زمانے میں کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ قلی قطب شاہ سے لے کر داغ اور امیر تک کی اردو شاعری پر نظر ڈالیے، کوئی قابلِ ذکر شاعر اپنے زمانے کی سیاست، حالات کی رفتار اور انقلابات کی کشمکش سے بے بہرہ اور بیزار نظر نہیں آئے گا۔ پھر ایک ایسا شاعر کس طرح سیاسی مد و جزر سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا، جو ایک ایسی صدی کی پیداوار ہے جسے انسانی بیداری کی صدی کہا جا سکتا ہے اور جو ایک ایسے ملک کا فرزند ہے جہاں موجودہ صدی کے آغاز سے پہلے غلام اور آقا کا امتیاز، مشرقی اور مغربی علوم اور تہذیب کا تصادم، تاریخ کے تدریجی ارتقاء کے زینے طے کر رہا تھا اور بالآخر جسے خود اپنی صدائے قُم سے اپنے ملک اور قوم کے از کار رفتہ اذہان کو بیدار اور انقلاب اور آزادی کے لئے تیار کرنا تھا۔ اگر سودا کی شہر آشوب اور نظیر کی پوری شاعری اپنے زمانے کے سماج کی پیداوار ہے، اگر میر کی غزل اپنے دور کے اندرونی کرب کی آئینہ دار ہے، اگر غالب کی بعض مسلسل غزلیں اور قطعات، مومن کی رزمیہ مسدس و مثنویاں، داغ کی دلی کی بپتا اور حالی کی مد و جزرِ اسلام وغیرہ واقعاتی، قومی اور سیاسی شاعری کا ناقابلِ تردید اظہار ہے تو ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی آواز اس پورے شاندار ماضی کی ارتقائی شکل اور پوری اُردو شاعری کا شاہکار ہے۔"

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال اپنے پیش روؤں کے برخلاف جدید مغربی علوم کا ماہر اور جدید معاشی و سیاسی تحریکات کا نبض شناس بھی تھا۔ اسے ایک ایسا زمانہ ملا جس میں وہ

انسانی نفسیات اور محسوسات کو شعر کا حسین جامہ پہنانے کے علاوہ حالات کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے کر کسی ذہنی انقلاب کا نظام بھی مرتب کر سکتا تھا اور اقبال کے خلاق ذہن نے یہی کیا اسی لئے وہ اپنے پیش روؤں کی صفِ اوّل میں بھی سب سے الگ اور نمایاں نظر آتا ہے۔

"اقبال کا سیاسی کارنامہ" میں محمد احمد خان صاحب نے اقبال کی نظم و نثر کے عمیق مطالعہ کے بعد اس کے ذہنی اور عملی تغیرات اور محرکات کا جائزہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ لیا ہے۔ اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس اچھوتے لیکن خشک موضوع کو اپنے پُر جوش اور شگفتہ طرزِ تحریر سے دلکش بنا دیا ہے۔ اگرچہ بعض جگہوں پر ان کا خطیبانہ اندازِ تحریر طبیعت پر گراں گزرتا ہے، تاہم اب تک اقبال کے سیاسی اقوال و اعمال کی تفصیلات ہیں مختلف مضامین مکتوبات، تذکروں اور خود ان کے خطبات میں مل جاتی تھیں۔ لیکن ان بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کا سہرا محمد احمد خاں کے سر ہے۔ اقبال کے ذخیرۂ نظم و نثر میں لاتعداد موضوع بکھرے پڑے ہیں، جو کسی متلاشی اور متجسس قلم کے منتظر ہیں۔ بارے اس طرح کا ایک موضوع احمد خاں کے متلاشی قلم کی گرفت میں آ گیا اور ایک مستقل تصنیف کی صورت میں ہمارے سامنے ہے پانچسو تینتیس صفحات کی اس ضخیم کتاب میں اقبال کے ذہنی ارتقاء، ملک کے معاشی معاشرتی اور سیاسی حالات اور اس کا پس منظر ہماری نظروں کے سامنے ایک جیتی جاگتی تصویر کی طرح آ جاتا ہے کہیں کہیں واقعات کے تجزیہ اور اشخاص کے متعلق مصنف کی رائیں محلِ نظر ہیں۔ مثلاً جواہر لال نہرو کے بارے میں مصنف کی طویل خامہ فرسائی، لیکن چونکہ یہ ذاتی پسند کا مسئلہ ہے اور مقصودِ تصنیف پر اثر انداز نہیں ہوتا اس لئے جا بجا اعتنا بھی نہیں۔

لہ محمد احمد خاں صاحب کا شمار جامعہ عثمانیہ کے متاخرین کی صفِ اول کے مؤرخین اور ادباء میں ہوتا ہے۔ بہادر یار جنگ کے فیض یافتہ خوش بختوں میں سے ہیں آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں کراچی میں شائع ہوئی۔

مقامِ اقبال[1]

سید اشفاق حسین کی تصنیف ہے ۱۹۲۵ء میں پہلی بار ادارہ اشاعتِ اردو (حیدر آباد دکن) نے شائع کیا۔ دوسری بار اسی ادارہ کے مالک نے ۱۹۵۲ء میں کراچی سے اس کو شائع کیا۔ اقبال کے متعلق اب تک جتنے مضامین یا کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں "مقامِ اقبال" کو خاص مقام حاصل ہے۔ ہمیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ قاضی عبد الغفار مرحوم نے حیدرآباد ریڈیو سے اس پر تبصرہ نشر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اقبال کے متعلق یہ پہلی تصنیف ہے جسے پڑھ کر میں مقامِ اقبال کو سمجھ سکا"۔

عام طور پر لوگ نہیں جانتے کہ اشفاق حسین نے یہ مقالہ کس لئے اور کن حالات میں لکھا تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد انہیں "ریسرچ اسکالر" کی سند حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی عنوان پر کوئی مقالہ لکھنا تھا۔ اقبال ان کا محبوب شاعر تھا۔ اس لئے کسی اور عنوان پر لکھنے کی بجائے انہوں نے اقبال کو منتخب کیا۔ اور اس طرح اقبالیات کے سلسلہ میں ایک قابلِ قدر تصنیف کا اضافہ ہوا۔ مقالہ اربابِ جامعہ عثمانیہ کے سامنے پیش ہوا، پسند کیا گیا، اور انہیں "ریسرچ اسکالر" کی سند مل گئی۔ اور اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس کی اشاعت کے بعد قبولیتِ عام کی سند بھی انہیں حاصل ہوگئی۔ اشفاق حسین نے "مقامِ اقبال" کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے "تاریخ و تمدن"، "فلسفہ اور شاعری" ابتدائی دونوں حصے بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور فکرِ اقبال تک پہنچنے میں

---

[1] سید اشفاق حسین ابھی طالب علمی ہی میں "اختر کی ڈائری" کے توسط سے ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور "مقامِ اقبال" نے تو اہلِ علم کے نزدیک ان کے مقام کو اور اونچا کر دیا۔ کاش ان کا زیادہ وقت علمی مشاغل میں گزرتا! سنا ہے آج کل حیدرآباد ریڈیو کے اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر ہیں۔ پی۔ ایچ ڈی کے انتظام سے پہلے جامعہ عثمانیہ میں تحقیقی کاموں کی اسناد اسی نام سے دی جاتی تھیں۔

مدد دیتے ہیں، خشک سے خشک موضوع کو اشفاق حسین نے اپنے سلجھے ہوئے اندازِ بیان اور شگفتہ طرزِ تحریر سے لطیف بنا دیا ہے۔

"مقامِ اقبال" کا آخری باب "شاعری" پچھلے ابواب کے مقابلے میں تشنہ اور کچھ کمزور سا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت دوا روی میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ باوجود اختصار کے اقبال کی شاعری کے متعلق مصنف نے عام نقادوں سے ہٹ کر اور کھل کر دو ٹوک باتیں کہی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

اس نے مشرق اور مغرب سے گزر کر شاعری کا عالمگیر تصور پیش کیا اور اس کی شعری بلندیوں نے جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر انسانی برادری کا نصب العین اجاگر کیا، جو تمام تر انسانیت کے احترام اور افضلیت پر مبنی ہے اس نے نہ صرف اجتماعی شعور کو بیدار کیا بلکہ تقدیر کی باگ انسانوں کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ اتنا بڑا کہ اسے پچھلے دور کی شاعری کے پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔[1]

اقبال کا تصورِ زماں و مکاں

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی[2] اس کے مصنف ہیں اور سارھے تالیس[3] صفحات کے اس مختصر لیکن نہایت اہم رسالے کو ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد دکن نے پہلی بار ۱۹۴۲ء اور دوسری بار ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ تصنیف کا عنوان اور مصنف کا نام خود اس بات کی شہادت اور ضمانت ہے کہ اس

---

[1] مقامِ اقبال ص ۲۰۰ - ۲۰۸

[2] ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کسی ملک اور کسی جامعہ کے لئے باعثِ فخر و افتخار ہو سکتے ہیں لیکن یہ فخر حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کا مقدر ہو چکا تھا کہ بین الاقوامی شہرت کا یہ ریاضی داں اور عالم ان کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھے۔ آج کل ڈاکٹر صاحب موصوف پاکستان میں اٹامک انرجی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔

ٹھوس سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا قلم ہی فکرِ اقبال کے گوشوں کا احاطہ کر سکتا تھا۔ زمان و مکاں کے متعلق عوام کے، حکمائے یونان کے اور علمائے اسلام کے تصورات کو بیان کرنے کے بعد جدید فلاسفہ اور سائنس دانوں کے خیالات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور اس سارے سفر میں اقبال کی رہنمائی کا دامن ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا۔ جابجا اقبال کے اشعار اور خطبات کے حوالے بھی دیتے چلے گئے ہیں۔ ایک جگہ انہوں نے آئین اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے سلسلہ میں اقبال کے ایک اعتراض کی تردید بھی کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اقبال نظریۂ اضافیت کے اصول کے بحیثیت مجموعی قائل ہیں لیکن اس پر ان کا ایک اعتراض بھی ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں ان کا یہ اعتراض اس نظریہ سے متعلق ایک غلطی پر مبنی تھا۔ جو عام طور پر غیر ریاضی دانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرے فلسفیوں کی طرح اقبال نے بھی یہ خیال کیا کہ نظریۂ اضافیت نے وقت (زماں) کی حقیقت اور ذاتیت کو فنا کر دیا ہے۔ اور وقت کو فضا کی ایک چوتھی سمت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح مستقبل ایک مقرر کردہ چیز بن جاتا ہے جو اسی طرح معین ہے جس طرح ماضی۔ اس طرح زمان کی تخلیقی حرکت باقی نہیں رہتی اور کائنات میں تقدیر اور جبر کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ نظریۂ اضافیت کا یہ تصور جو فلاسفہ اور ان کے ساتھ اقبال نے لیا ہے، صحیح نہیں ہے۔"[1]

پھر آگے چل کر انہوں نے سمجھایا ہے کہ وقت چوتھی سمت ضرور ہے لیکن فضا یعنی مکان کی چوتھی سمت نہیں بلکہ زمان و مکاں کے سلسلے کی چوتھی سمت ہے اور نظریۂ اضافیت میں وقت اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ فضا۔ شاید اسی لئے ڈاکٹر رضی الدین نے آئین اسٹائن کے نظریۂ اضافیت پر خود اقبال کے ایما پر ایک مستقل کتاب لکھ دی تھی چنانچہ اس کے دیباچہ میں وہ فرماتے ہیں۔

---

[1] اقبال کا تصورِ زمان و مکاں صفحہ ۴۳

"اس[1] کتاب کو میں نے ۱۹۳۸ء کے اوائل میں علامہ اقبال کی خاطر لکھنا شروع کیا تھا مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ نظریہ اضافیت کے بنیادی اصولوں سے واقف ہو جائیں تاکہ جدید فلسفہ پر اس نظریہ کا گہرا اثر ہوا ہے، اس کا اندازہ کر سکیں۔ ابھی کتاب کے پہلے تین باب بھی نہیں ختم ہوئے تھے کہ علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا؛"

سائنس کو ادب کی زبان میں پیش کرنا، ڈاکٹر رضی الدین کی خصوصیت ہے اور اس وجہ سے بھی رسالہ "اقبال کا تصور زمان و مکان" سلسلہ اقبالیات میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اقبال (فن اور فکر)

اس کے مصنف جناب سید عبد الواحد[2] صاحب ہیں۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ پریس حیدرآباد میں طبع ہوئی تھی۔ کتاب میں اقبال کی تصویر کے علاوہ دو مکتوبات کے عکس بھی شامل ہیں جن میں سے ایک مصنف کے نام ہے اور ان کے ساتھ حیدرآباد کے مشہور فنکار عبد القیوم کی بنائی ہوئی تصویر "رومی اور اقبال" بھی شریک ہے، کتاب کے دس ابواب میں وہ ساری تفصیلات سمیٹ لی گئی ہیں، جن سے اقبال کی ذہنی نشو و نما میں مدد ملی ہے، وہ سارے محرکات، واقعات اور حالات جن سے اقبال کے فلسفہ و شعر نے جلا پائی، بیان کر دیئے گئے ہیں اور جا بجا ان کے اشعار (اردو فارسی) ترجمہ اور متن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے پڑھنے والے کو ترجمہ کے ساتھ اصل کا لطف بھی حاصل ہو جاتا ہے کہیں کہیں مصنف سے شعر کے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ کتاب کا گیارہواں[3] باب اس لئے زیادہ

---

[1] اضافیت شائع کردہ انجمن ترقی اردو [2] سید عبد الواحد صاحب اجمیر کے رہنے والے اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایم اے ہیں لیکن زندگی کا بہت بڑا اور قابل قدر زمانہ حیدرآباد میں فارسٹ کمشنر کی حیثیت سے گزار چکے ہیں۔ حیدرآباد کے اقبالیین میں ان کی شمولیت سے زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی [3] اقبال (فن اور فکر) صفحات ۲۶۰، ۲۷۷، ۲۰۳

اہم ہے کہ وہ اقبال کی نثر سے متعلق ہے۔ اقبال کی شاعرانہ شخصیت اتنی بلند و بالا ہے کہ ان کی نثر کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے حالانکہ اقبال دنیا کے ان چند بڑے شاعروں میں سے ہیں جنہیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ اقبال نے جو کچھ نثر میں لکھا، اس مرتبہ کی چیزیں عالمی ادب میں بھی خال خال نظر آتی ہیں، بقول مصنف مشرقی ادب میں المعری، سعدی، غالب اور بانا (سنسکرت کا مشہور شاعر) اور مغربی ادب میں گوئٹے، وکٹر ہیوگو، ملٹن، کولرج، اسکاٹ، ورڈسورتھ، میتھو آرنلڈ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے نظم و نثر میں اپنی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر لوگ ایسے ہیں جن کی نظم و نثر کو میزان میں برابر برابر نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اقبال کے توسیعی لکچروں پر سرڈینی سن راس نے جو رائے ظاہر کی ہے، وہ اقبال کو ان عظیم شاعروں کی صف میں ایک ممتاز جگہ دیتی ہے۔ اقبال ایک اور خصوصیت کے حامل بھی تھے اور وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ان کی اردو انشاپردازی ہے، بعض اوقات یہ امر بحث طلب ہو جاتا ہے کہ ان کی انگریزی تحریریں زیادہ دلکش ہیں یا اردو۔

اقبال سے واحد صاحب کو جو عقیدت ہے اس کی مثالیں اس کتاب کے ہر صفحہ پر بکھری پڑی ہیں۔ اقبال پر انگریزی میں اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں "اقبال (فن اور فکر)" ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

حکمتِ اقبال

اس کے مرتب بھی غلام دستگیر رشید ہیں اور اس مجموعۂ مضامین کو نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن نے فروری ۱۹۴۵ء میں شائع کیا تھا، رشید صاحب کے مرتبہ دوسرے مجموعوں کی طرح اس میں بھی ماخذ کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں اتنی ضروری بات کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حیدرآباد سے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر میر ولی الدین، میر حسن الدین، غلام دستگیر رشید

اور بیرونِ حیدرآباد کے اہل قلم میں خود اقبال کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، راغب احسن، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر سید عبداللہ، خواجہ عبدالحمید اور آنسہ عائشہ بلقیس عمر شامل ہیں، اس مجموعہ کے ہر مضمون کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ اقبال کی حکیمانہ شاعری کے رموز و نکات تک پہنچنے کی کامیاب کوشش ہے اور تمام مصنفین نے اپنے موضوعات کا حق ادا کیا ہے اور سلسلہ اقبالیات میں "حکمتِ اقبال" ایک مفید اضافہ ہے۔

مرقعِ اقبال

مرقع کی یہ مصور پیشکش بزمِ اقبال کے دسویں سالانہ جلسہ یومِ اقبال کے موقع پر ۱۹۴۸ء میں شائع کی گئی تھی۔ اس مصور و خوبصورت مرقع میں حیدرآباد کے کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر نہیں، اس میں صرف چغتائی کی چند ایسی تصاویر شائع کی گئی ہیں جو اقبال کے منتخب اشعار سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ ہم نے "بزمِ اقبال" کے باب میں لکھا ہے، یہ مرقع اصل میں پیش خاکہ تھا ایک بڑی اسکیم کا، جو بدقسمتی سے پوری نہ ہو سکی، تیس صفحات کے اس مرقع میں نظام دکن اور اقبال کی تصویروں کے علاوہ چغتائی کے متعلق اقبال کے خیالات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد صدر بزمِ اقبال حیدرآباد، حسن یار جنگ کا پیش لفظ معہ ان کی تصویر کے اور ہفتہ اقبال کی نمائش تصاویر و کتبات کے صدر خواجہ محمد احمد (ناظم محکمہ آثار قدیمہ) کا تعارف اور "شاعر مشرق اور بہزادِ مشرق" کے عنوان سے بزمِ اقبال کے معتمد عمومی معین الدین کوڈاس کا لکھا ہوا مختصر سا مضمون بھی شامل ہے۔ ٹائیٹل چغتائی کی نظر افروز تصویر شہزادہ اورنگ زیب سے مزین ہے اور اس کے نیچے اقبال کا یہ شعر لکھا ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مرقع کے اندر کے صفحات میں پانچ اور تصاویر شائع کی گئی ہیں، علی الترتیب جن کے عنوانات ہیں "خنجرِ ہلال" اور تصویر کے نیچے شعر درج ہے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

"فرزندِ مجاہد"

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

"جہانگیر اور نور جہاں"

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

"خلوت"

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ "زبورِ عجم"
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

"قلندر"

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

مرقع کے بقیہ صفحات نمائش کی دوسری تصاویر کی تفصیلات، عنوانات اور اشعار کے لئے وقف ہیں۔ یہ نمائش کیوں منعقد کی جاتی تھی، اس کی وجوہ آپ صدر بزمِ اقبال کی زبانی سنئے۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

علامہ اقبال کے کلام میں بنی نوع انسان کے واسطے اور خصوصاً ممالک اسلامیہ کے لئے
جو دل کو گرمانے، روح کو تڑپانے اور جذبات کو ابھارنے والا پیام موجود ہے اس کو
زیادہ سے زیادہ عام کرنے، ملک و بیرونِ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کی اہمیت کو
میں ایک بڑی مدت سے محسوس کر رہا تھا چونکہ علامہ کے فلسفہ کی گہرائیوں کی وجہ سے ان
کا کلام عوام کے لئے آسان الفہم نہیں ہے اس لئے میں نے چند ایسی تدبیروں کی طرف
توجہ کی جن کے ذریعہ علامہ کے اہم پیامات و تعلیمات کو عوام کے ذہن پر مرتسم کیا جا
سکے چنانچہ ان کے کچھ آسان اور پُراثر کلام کو بڑے بڑے اور دیدہ زیب کتبوں کی شکل
میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور متعدد بار ان کی نمائش کی گئی۔ انعامات دے کر
علامہ اقبال کے کلام و پیام پر مضامین و مقالے لکھوائے گئے تاکہ عوام کو علامہ کے کلام
کو پڑھنے اور ان کے پیام پر گہری نظر ڈالنے کا موقع حاصل ہو اور سب میں زیادہ مؤثر
صورت یعنی علامہ کے اہم کلام کو تصویری جامہ پہنانے کا کام سب سے پہلے میں نے
حیدرآباد ہی میں شروع کروایا۔ چنانچہ علامہ کے کلام پر ملک اور بیرونِ ملک کے مصوروں
سے متعدد تصویریں بنوائی گئیں اور مرکزی بزمِ اقبال کی زیرِ سرپرستی ملک کے مختلف
حصوں میں ان کی کئی بار نمائش کرائی گئی۔ اس طریقہ کو میں نے بہت زیادہ مؤثر پایا
اور عوام پر اس کا نتیجہ خیز اثر دیکھا اس اثر کے مدنظر اس طریقہ کی زیادہ سے زیادہ
نشر و اشاعت کی خاطر ان تصویروں میں سب میں اچھی تصویروں کے ایک دیدہ زیب
مرقع کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اس مرقع کا خاکہ تیار کروایا گیا اور بعض تصاویر
کے بلاکس بھی بنوائے گئے مگر اس کی اشاعت کے قبل ہم نے خیال کیا کہ اس مرقع میں
ملک کے کسی مشہور ترین مصور کی فن کاری کے نمونے ضرور شریک ہوں تاکہ یہ زیادہ سے

زیادہ مقبول ہو سکے ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے بہزادِ ہند خان بہادر عبدالرحمان چغتائی

سے بہتر اور کون مصور ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اہم کام ملتوی کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۶ء

میں جب میں لاہور گیا تو میں نے چغتائی صاحب سے خاص طور سے ملاقات کی اور ان

سے اس مرقع کے لئے علامہ اقبال کے کلام پر چند تصویریں تیار کرنے کی خواہش کی۔

چغتائی صاحب نے میری اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے تصویروں کی تیاری کا وعدہ فرمایا

مجھے مسرت ہے کہ خان بہادر عبدالرحمان چغتائی صاحب نے ایک مختصر مدت میں اس کو

عملی جامہ پہنایا اور آج ہم ملک میں ان اہم تصاویر کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔

اس مرقع کو دیکھ کر تشنگیٔ نگاہ اور بڑھ جاتی ہے اور بے ساختہ دل سے آواز آتی ہے

کہ کاش وقت اتنی مہلت دیتا کہ نمائش ہفتہ اقبال کی ساری تصویریں چھپ جائیں اور اس طرح

مطالعۂ اقبال کے لئے ایک نیا زاویۂ نظر میسر آ جاتا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال[1]

اس کتاب کی یہ عجیب صفت ہے کہ یہ اردو میں بھی ہے اور عربی میں بھی، نظم میں

بھی ہے اور نثر میں بھی۔ اس کی بنیاد تو ایک تقریر ہے جو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

صاحب نے "یوم اقبال" حیدرآباد کے موقع پر اردو میں کی..... ان کی یہ تقریر اعظمی صاحب[2]

---

[1] الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال ص
[2] پروفیسر محمد حسن الاعظمی اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں

جامعہ ازہر کے فاضل اور استاد اور عربی میں کئی کتابوں کے مصنف، دوسری جنگِ عظیم کے دوران

ہندوستان اور پھر حیدرآباد آ گئے تھے، بزمِ اقبال کے سرگرم کارکن تھے۔ آج کل کراچی میں

عربی کالج چلا رہے ہیں۔

کو پسند آئی۔ انہوں نے چاہا کہ عرب ممالک کے مسلمان بھی اقبال کے فلسفۂ حیات و موت سے مستفید ہوں۔ انہوں نے اس تقریر کو عربی نثر میں ادا کیا اور شیخ الصاوی شعلان صاحب مصری کی مدد سے اقبال کے ان اشعار کا جو صدیقی صاحب کے مضمون میں پیش کئے گئے تھے، عربی نظم میں ترجمہ کرا دیا ...... شیخ الصاوی شعلان اقبال کے اشعار کے مطالب کو صحیح طور پر ادا کرنے میں اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

کلام اقبال کے کئی حصے انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں لیکن دنیائے اسلام کے اہم ترین حصص عربی بولنے والی قوموں سے پُر ہیں، اس لئے ان تک اقبال کے پیغامِ حیات کا پہنچنا بہت امید افزا ہے۔"

مندرجہ بالا چند جملے اس طویل تعارف کے ہیں جو سر عبد القادر نے مذکورہ کتاب کے لئے لکھا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ بزمِ اقبال کے صدر حسن یار جنگ نے لکھا تھا وہ فرماتے ہیں۔[1]

پیش لفظ میں صرف اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبال کے کلام و پیام کی نشر و اشاعت میں حیدر آباد دکن کس قدر دلچسپی لے رہا ہے اور یہاں اس سلسلے میں کس قدر اہم کام ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال کا "فلسفۂ حیات و موت" جو ان کے فلسفۂ خودی کے بعد ان کے فلسفہ کی جان ہے۔ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ علامہ کے اس بلند فلسفۂ اسلامی پر سب سے پہلے ہماری ہی مملکت کے ایک سپوت ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے نہایت بسیط مضامین لکھے جو طول و عرض ہندوستان میں بیحد مقبول ہوئے، پروفیسر حسن الاعظمی صاحب کی یہ تصنیف انہی مضامین سے ماخوذ ہے ......

---

[1] الحیاہ والموت فی فلسفۃ اقبال ص ۱۰، ۳

اس کتاب کے آخر میں علامہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصری نوبزان ہیڈ دپرنسپل کلیۃ اللغۃ العربیہ جامعہ ازہر) اور شیخ الصاوی شعلان مصری (من علمائے ازہر کے بعض مضامین اور قصائد بھی شامل کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے علامہ اقبال کی عظمت اور ان کے اعلٰے تخیلات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

تعارف اور پیش لفظ کے اقتباسات کتاب کا بہت اچھا تعارف بھی ہیں اور تبصرہ بھی اقبال کے قدیم یار نغز گفتار سر عبدالقادر مرحوم نے اس کام کو سراہا اور تعارف لکھ کر نہ صرف ناشرین اور مؤلف کی ہمت افزائی کی بلکہ اپنی عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دیا مصنفین میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے بھی شامل ہیں یہ وہی عزام بے ہیں جو بعد میں پاکستان میں مصر کی سفارت کے اہم فرائض انجام دے چکے ہیں اور اس تالیف کے بہت عرصہ بعد جنہوں نے اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ عربی میں کیا، لیکن ان کے دل میں اس کام کی پہلی لگن ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد کی بزم اقبال نے پیدا کی تھی۔

دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل اس تالیف کو بزم اقبال نے بانگ درا سائز پر نہایت دیدہ زیب طریقہ سے شائع کیا۔

اقبال پر فارسی میں رسالہ

داعئ[1] اسلام آقائے محمد علی کے لکھے ہوئے اس رسالہ کا ہمیں علم تھا لیکن باوجود کوشش کے یہ رسالہ ہمیں پاکستان میں دستیاب نہ ہو سکا اور نہ کسی نے حیدرآباد سے روانہ کرنے کی زحمت گوارا کی، اتفاق سے حال ہی میں آقائے مجتبیٰ مینوی کی تصنیف علامہ اقبال

---

[1] داعی اسلام فرہنگ نظام کے مؤلف ہیں۔ کئی برس تک نظام کالج میں فارسی زبان کے پروفیسر رہے۔ دس زبانوں کے ماہر ہیں۔ فارسی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ داعی تخلص ہے۔

جس کا ترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم نے کیا ہے، ہمیں مل گیا۔ اسی ترجمہ کو لاہور کی بزمِ اقبال نے شائع کیا۔ اس کے صفحہ (۲) اور (۴) پر مصنف کے یہ جملے ملتے ہیں۔

"اور اگر میں غلطی نہیں کرتا، علامہ اقبال کے بارے میں ایک مختصر سا مقالہ کسی ایک فارسی کتاب میں طبع ہوا اور وہ زیادہ تر ان کے استعمال کئے ہوئے فارسی الفاظ و تراکیب کی خورده گیریوں پر مشتمل تھا۔ اس مقالے کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے (۴۶) صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ فارسی میں چھپا ہے اور وہ بھی ایک خطبہ کی صورت میں ہے۔ جو آقائے سید محمد علی داعی اسلام نے حیدرآباد دکن میں شعبۂ جامعہ معارف میں دیا تھا اور شائد ہی کسی نے ایران میں اس رسالہ کو دیکھا ہو ...... جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ آقائے داعیِ اسلام نے انصاف اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ اقبال کی شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کے معانی اور مطالب ہیں اس مختصر سی کتاب میں جو اقبال کو لوگوں سے روشناس کرانے کے لئے لکھی گئی ہے اس کے کچھ اشعار درج کئے گئے ہیں۔

حیرت ہے کہ جو کتاب فارسی زبان میں اقبال کو روشناس کرانے کے لئے لکھی گئی، اسے ایران میں کسی نے نہ دیکھا اور آقائے مجتبیٰ مینوی اس سے واقف ہو گئے۔ یہی غنیمت ہے کہ انہوں نے اس کی اولیت اور اہمیت کا اعتراف کر لیا۔ بہر حال یہ شرف کیا کم ہے کہ حیدرآباد کے ایک ایرانی نژاد پروفیسر نے فارسی زبان میں اقبال پر پہلی بار ایک رسالہ لکھا۔

فکرِ اقبال

تین سو بیس صفحات کی اس کتاب کو پروفیسر غلام دستگیر رشید نے مرتب کیا ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سید ظفر الحسن، پروفیسر محمد مجیب اور سید نذیر نیازی شامل ہیں۔ اور "خلافت اسلامیہ" پر اقبال کا مقالہ مترجمہ چودھری محمد حسین اور "علم اور مذہبی واردات" کے عنوان پر اقبال کا مضمون مترجمہ میر حسن الدین (عثمانیہ)، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون "رومی اور اقبال کا تصورِ محبت" مترجمہ عبدالرحمٰن سعید (عثمانیہ) اور پروفیسر ایم۔ایم شریف کا مضمون "اقبال کا تصورِ باری تعالیٰ" مترجمہ عبدالرحمٰن سعید (عثمانیہ) بھی شریک ہیں۔ ان کے علاوہ اقبال کا اردو میں لکھا ہوا مضمون "اسلامیات" اور نواب بہادر یار جنگ کی مشہور تقریر "اقبال کا پیامِ آزادی" بھی شامل ہے۔ اس تقریر کے بعض اہم حصے آپ اسی کتاب کے حصہ دوم میں پڑھیں گے۔

اس مجموعۂ مضامین میں بھی یہ بات کھٹکتی ہے کہ مرتب اور ناشر نے مضامین کے ماخذ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس فروگذاشت کے باوجود یہ مجموعۂ اقبالیات کے سلسلے میں گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کو اس نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے کہ انسانی فکر علی الخصوص فکرِ مسلم کی تعمیر میں اقبال کے کام کو نمایاں کیا جائے۔ چنانچہ مرتب لکھتے ہیں۔

تطہیرِ فکر صرف سلبی پہلو ہے، نفی کا پہلو ہے۔ تخریب اور تطہیر کے بعد تعمیر کی منزل ہے اور یہی منزل مقصود ہوتی ہے اس کے لئے اس مادی عبرت زار سے آگاہ ہونا اور اس سے قطع تعلق کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ یہاں ایسا دیدہ ور مطلوب ہے جو نفی کے بعد اثبات و ایجاب کی شاخ طوبیٰ پر اپنا آشیاں بنائے، حکمت ایمانی اور حقیقت اسلامی کا مرتبہ شناس ہو۔

کلام اقبال سراپا حکمت اسلام ہے۔ حکمتِ جدید کے کمی فریب دہ نظریات پر

ٰ فکر اقبال شائع کردہ اردو اکیڈمی سندھ ۶ ء

اقبال نے نہایت حکیمانہ اور عالمانہ تنقید کی ہے، کھوٹے کھرے کو خوب پرکھا ہے اپنے روشن ضمیر سے فکر جدید کے اندھیروں کو دور کیا ہے یہ ان کا عمل تطہیر ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خدا نے ان پر انبیاء کی حکیمانہ تعلیمات کی خوبیاں الم نشرح کر دی ہیں۔ تاکہ مردحق بند باطل میں گرفتار نہ ہو۔ اسی معنی میں فکر اقبال عقل ذوفنون سے بالاتر ہے اور "معنی جبریل وقرآن ہے" اس کا مقصد تربیت انسانی میں فطرت اللہ کی نگہبانی کرنا ہے۔

معنیٔ جبریل و قرآن است او
فطرت اللہ را نگہبان است او[1]

اس مجموعے کے سبھی مضامین بصیرت افروز ہیں لیکن ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مقالہ "اقبال حضورِ باری میں" جو اس کتاب کے چھپن[۵۶] صفحات میں پھیلا ہوا ہے بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو، یہ خیال ہمیں اس لئے آیا کہ پچھلے سال کے ہفت روزہ لیل و نہار کے کسی شمارہ میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کے ایک مباحثے کی روداد نظر سے گزری تھی، مباحثہ کا عنوان تھا "حضور باری میں اقبال کا طرزِ تخاطب" طویل بحث و گفتگو کے بعد بہت سے "معترضین اقبال" کی موجودگی میں جو "فتویٰ" صادر ہوا وہ یہ تھا کہ حضور باری میں اقبال کا طرز تخاطب اور لہجہ گستاخانہ ہوتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں (جو اس مباحثہ سے برسوں پہلے لکھا گیا) اس عجیب و غریب "فتویٰ" کا عالمانہ جواب ملتا ہے۔ اس جلسے کے شرکاء کو خصوصیت سے اسے پڑھنا چاہیئے

اقبال نئی تشکیل :- اس کے مصنف ہیں عزیز احمد[2]۔ پانچسو چورانوے صفحات کی

---

[2] عزیز احمد (ریڈر) ریڈر انگریزی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے مشاہیر لکھنے والوں میں ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ضخیم کتاب اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی جانفشانی سے لکھی گئی ہے اور اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو تین "خانوں" میں تقسیم کر کے یعنی اس کے شعر و حکمت کے تین دور "وطن پرستی۔ اسلامی شاعری" اور "انقلابی شاعری" متعین کئے ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں اس طرح کی تشکیل اگرچہ اچھی کوشش ضرور ہے لیکن اس جدت نے جہاں مصنف کے وسیع مطالعہ کے شواہد فراہم کئے ہیں وہاں بے شمار علمی و تاریخی بحث طلب مسائل بھی کھڑے کر دیئے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی مثالیں پیش کرنے میں انہوں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ مثلاً وطن پرستی کا دور میں بحث کے ایک انتہائی نازک مقام پر وہ لکھتے ہیں۔[1]

۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء کے زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی طور پر محسوس کیا کہ مذہب، تمدن اور معاشیات کے اعتبار سے وہ بہت سے ایسے جداگانہ حقوق رکھتے ہیں جن کا تحفظ ضروری ہے۔ لارڈ منٹو کے پاس مسلمان امراء اور برسرآوردگان کا وہ مشہور و معروف ایڈریس پیش ہوا جس کے بعد سے سامراجی شہنشاہی کے زیر سایہ ہند و مسلم، معاشی اور سیاسی مقابلے میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ سامراج نے طے کیا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کو کافی دبایا جا چکا ہے اور کہیں ہندو زیادہ طاقتور نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کے اس ایڈریس کے متعلق مولانا محمد علی نے جو کانگریس کے صدر تھے یہ رائے دی کہ یہ کھیل سرکار کے اشارے سے ہو رہے ہیں۔

خط کشیدہ الفاظ کے ترقی پسندانہ استعمال کے قطع نظر ۱۹۰۲ء کے ایڈریس کے متعلق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور کسی تعارف کے محتاج نہیں، شعر، ڈرامہ، افسانہ، ناول اور تنقید میں اپنی طبعِ خداداد کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ ان کے بعض ہنگامہ خیز ناولوں نے بڑی شہرت پائی ہے۔ سنا ہے کہ آجکل لندن یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اقبال نئی تشکیل ص ۲۳

مولانا محمد علی کی رائے کا سہارا عجیب ہے کہاں ۱۹۰۶ء اور کہاں محمد علی کی صدارتِ کانگریس کا زمانہ! "ہو رہے ہیں" لکھ کر مصنف نے زمانوں کا فرق مٹا دیا ہے۔ اسی قبیل کی دعاوی کی مثالیں اس میں بکثرت ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ مصنف نے ایک خاص نقطۂ نظر (جو حقیقی معنوں میں پنہاں ہے نہ واضح طور پر نمایاں ہے) کا چشمہ اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا ہے اور جیسی من میں موج اٹھتی ہے، ویسے ہی "فیصلے" صادر کرتا چلا جاتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اقبال جو ہے اس کو اسی نظر سے جانچا جاتا۔ بہر حال اقبال کی اس نئی تشکیل کی افادیت سے انکار مشکل ہے۔

"اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی"

عزیز احمد کی اقبال نئی تشکیل کے تبصرہ و تعارف کے بعد ہی اتفاق سے ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی کی یہ دلچسپ اور عالمانہ تصنیف ہمیں مل گئی۔ جیسا کہ ابھی ابھی ہم نے لکھا تھا "ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اقبال جو ہے، اس کو اسی نقطۂ نظر سے جانچا جاتا" ہمارے اس نقطۂ نظر کی تائید زیرِ نظر کتاب کے ہر صفحہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اپنے ستھرے ذوقِ علم و مطالعہ کے علاوہ اس خصوصیت کی بھی حامل ہے کہ انہیں اقبال سے ذاتی تعارف بھی حاصل ہے۔[1] اقبال کی اس کہانی میں جو کچھ ڈاکٹر صاحب کی زبانی اور کچھ اقبال کی زبانی، بیان کی گئی ہے، اقبال کے شعر و فلسفہ کی عالمانہ تشریح و توضیح کے ساتھ ساتھ بعض ایسے واقعات کا بھی دنیا کو علم حاصل ہوتا ہے، جن سے بہت کم لوگ

---

[1] ڈاکٹر ظہیر الدین جامعہ عثمانیہ کے بالغ نظر اساتذہ میں سے ہیں۔ اقبال کے دوست بھی ہیں اور اس کے کلام کے رمز آشنا بھی۔ انقلاب حیدر آباد کے بعد بھی پیامِ اقبال کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں۔

واقف تھے اور جن کے پڑھنے سے اقبال کی شخصیت و کردار کا ایک عجیب و غریب پہلو سامنے آجاتا ہے۔ عزیز احمد نے لکھا تھا۔

"باوجود فقر کے فلسفہ کو کمال تک پہنچانے کے اقبال کسی نہ کسی طرح کی شاہ پرستی سے آخر تک اپنے دماغ کو چھٹکارا نہ دلا سکے۔ چنانچہ امان اللہ خاں نادر خاں شاہِ افغانستان، ظاہر شاہ یہاں تک کہ فرمانروائے بھوپال کو مخاطب کرکے انہوں نے نظمیں لکھیں۔ اقبال کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی نظموں سے مدح کا پہلو بالکل خارج ہو تا گیا اور موعظت اور عمل کا پہلو بڑھتا گیا لیکن موعظت اور خیر کی تلقین سعدیؒ کی زبانی اچھی معلوم ہوتی ہے اور سعدیؒ کے زمانے کے لحاظ سے موزوں بھی تھی، بادشاہوں کا ذکر اور ان کا گوارا کر لینا ہی اقبال کی انقلابی تعلیم میں خارج ہوتا ہے اور اس سے ایک ایسا تضاد پیدا ہوتا ہے جس کی تاویل نہیں ہو سکتی"۔[1]

اس "تضاد" کی "تاویل" تو بعد میں کی جائے گی۔ اس موقع پر آپ ڈاکٹر ظہیر الدین کی زبانی ایک کہانی سنیئے۔

"بچہ سقہ اور ملائے شور بازار کی ہڑ لونگ نے افغانستان کے تاجدار امان اللہ خاں کو تختِ افغانستان سے کنارہ کشی پر مجبور کر دیا تو نادر خاں نے جو پیرس میں مقیم تھے اس ملا گردی کو دور کرنے اور تباہی کے دلدل میں گرفتار افغانستان کو نجات دلانے کے لئے افغانستان کا عزم کیا تو ان کو خدا حافظ کہنے کے لئے لاہور کے اسٹیشن پر اقبال

---

[1] اقبال نئی تشکیل صفحہ ۸۲ و ۸۳ [2] اقبال کی کہانی ص ۹۵

بھی موجود تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے سے کچھ پہلے اقبال نے ان سے تخلیہ میں کہا:" تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ میں ایک فقیر آدمی ہوں، نیک تمناؤں اور دعاؤں سے ہی تمہاری خدمت کر سکتا ہوں، اتفاق سے پانچ ہزار کی رقم میرے ساتھ ہے اگر یہ تمہارے کام آ سکے تو مجھ کو بڑی خوشی ہوگی" نادر خاں نے جو چشم پرآب تھے فقیر کی اس دین کو بڑا ہی نیک شگون سمجھا اور بڑے احترام سے اس ہدیہ کو قبول کیا۔[1]

اس کے بعد نادر خاں افغانستان جاتے ہیں اور اپنے منصوبوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اقبال کو افغانستان آنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس جذبہ کے ساتھ کہ تخت افغانستان اس عظیم درویش مہمان کا عطیہ ہے اور جب اقبال افغانستان پہنچ جاتے ہیں تو پہلی ملاقات میں مغرب کی نماز کے موقع پر نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی، اقبال نے کہا "نادر، میں نے ساری عمر کسی شاہِ عادل کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے آج میں تیری اقتداء میں نماز پڑھوں گا، امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔"

مذکورہ واقعات اپنے اندر "شاہ پرست اقبال" کے کردار کے "تضاد" اور اس کی "تاویل" کے اسباب کے متلاشی نقادوں کے لئے کافی سامانِ غور و فکر رکھتے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل، پانچ ہزار کی خطیر رقم، جو ایک فقیر خدا مست کی "فغانِ نیم شبی" کی کمائی ہو، ایک مقدس جہاد کے لئے اس طرح نذر کر دینا، دنیادار ذہنوں کے سمجھنے کی بات نہیں۔ اس رمز آشنائی

---

[1] اقبال کی کہانی ص ۹۶ و ص ۹۷

کے لئے کم از کم اس زبردست خلوص کا ایک ہلکا سا پرتو بھی ضروری ہے جو اقبال کے افکار واشعار اور اس کی دعوتِ عمل میں پوشیدہ ہے "نگہ بلند" "سخن دلنواز" اور "جان پُرسوز" کی ضرورت ہے۔ "موعظت" اور "عمل" کی تلقین کے لئے ہر زمانہ میں کسی نہ کسی سعدی نے کسی نہ کسی بغداد پر آنسو بہائے اور مایوس دلوں میں امید کی کرن دوڑا دی، اقبال نے جس زمانے میں یہ فرض ادا کیا، اس وقت پوری ملتِ اسلامیہ سراپا بغداد کی تباہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس مسلسل اندھیرے میں اقبال جن "کھوئے ہوؤں کی جستجو" میں نکلے تھے۔ انہیں جہاں کہیں کوئی روشنی، کوئی کرن، کسی نادر، کسی ظاہر شاہ، کسی نواب بھوپال یا کسی نظامِ دکن کی شکل میں نظر آتی تھی، وہ اسے دلیلِ راہ سمجھتے تھے، چراغِ منزل نہیں۔ اقبال کو شاہ پرست یا قصیدہ گو قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ کس کس کا "وظیفہ خوار" اور کس کس کا مصاحب رہا اور کہاں کہاں "اترایا"۔ پھر "مرض الموت" کے زمانہ میں گوشہ گیری اور جہدِ معاش کے لئے ناقابل ہو جانے کی وجہ سے اگر انہوں نے نواب صاحب بھوپال کی دوستانہ اعانت قبول کر لی تھی تو یہ کوئی "جرم" نہیں۔ ایسے فعلِ مجبوری کی مثال دے کر یزداں شکار اقبال کی پیشانی پر شاہ پرستی کا لیبل چسپاں کرنا نہ صرف یہ کہ نامناسب ہے بلکہ تکلیف دہ ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

ڈاکٹر ظہیر الدین کی "زبانی اقبال کی کہانی" سلسلہ اقبالیات میں قابلِ قدر اور بصیرت افروز اضافہ ہے اور ضرورت ہے کہ ان کے بیان کردہ چند واقعات سے دنیا کو زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے۔

شاد اقبال :- اس کے مؤلف ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ ایک سو پچھتر صفحات

پر مشتمل بانگ درا سائز کا یہ مجموعۂ مکتوبات ۱۹۴۲ء میں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع کیا گیا تھا اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ دونوں کی تصویریں الگ الگ شائع کی گئی ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنے قدیم، گہرے اور مخلصانہ تعلقات کے باوجود انہوں نے کبھی ایک ساتھ تصویر نہیں کھنچوائی اور اگر کبھی کھنچوائی ہوگی بھی تو قابل مؤلف کو شاید مل نہ سکی ورنہ زیر نظر مکتوبات کی طرح یہ گروپ فوٹو بھی یادگار ہوتا۔

• شادِ اقبال کی اشاعت کے وقت بڑی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں لیکن بالآخر اسے اقبالیات کے سلسلے میں قابلِ قدر اضافہ مانا گیا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اقبال کے خطوط کی اشاعت میں اسے اولیت کا درجہ حاصل ہے، اس تالیف کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں خطوط اقبال کے ساتھ مہاراجہ کے جوابات بھی شامل ہیں۔ جن کے پڑھنے سے دونوں کے تعلقات کی نوعیت سمجھ میں آجاتی ہے فاضل مرتب کا مقدمہ بھی بہت اہم ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے، اس میں دونوں کی ملاقاتوں کی تفصیلات یکجا کردی گئی ہیں۔

اب یہ مجموعۂ مکتوبات نایاب ہوچکا ہے، ضرورت ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے محض اس خیال سے کہ مہاراجہ چونکہ بڑے امیر تھے، اس لئے اقبال کے حلقۂ ارادت میں کیسے شامل ہوسکتے تھے؟ بالکل سطحی سی بات ہے اور نہ صرف مہاراجہ بلکہ خود اقبال پر ظلم ہے کیونکہ اقبال مہاراجہ کی امارت کے نہیں، ان کے انکسار، تواضع اور ذوقِ شعر و تصوف کے دوست ہیں اور ان خطوط میں بیشتر خط ایسے ہی مباحث سے پُر ہیں۔ حیاتِ اقبال کا یہ رخ بھی بہت فکر انگیز اور دلچسپ ہے اور اس سے بھی دنیا کو مستفید ہوتے رہنا چاہئے۔

فلسفۂ عجم

اس کے مصنف خود اقبال ہیں اور مترجم میر حسن الدین، یہ ترجمہ بانگِ درا سائز کے

ایک سو تہتّر صفحات پر پھیلا ہُوا ہے۔ اسے انجمن اشاعت اُردو کے معتمد تصدق حسین تاج نے ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد دکن سے شائع کیا تھا کتاب کے تین حصے ہیں جو چھ ابواب پر مشتمل ہیں دیباچہ میں مترجم لکھتے ہیں "پیشِ نظر کتاب علامہ اقبال کی THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA کا ترجمہ ہے۔" ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال سے اس ناچیز نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ علامہ موصوف نے ازراہِ کرم اجازت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی، اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہُوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں، میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔"

لیکن مترجم نے اس وقت یہی سوچا تھا اور بالکل صحیح سوچا تھا کہ علمی دنیا میں تحقیقات کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ نظریات ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں، جس طرح افلاطون اور ارسطو کے نظریات رائج نہیں رہے لیکن ان کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے اسی طرح اقبال کی زیرِ نظر تصنیف بھی خود اقبال کے فکر میں انقلاب آنے کے باوجود اپنی تاریخی اہمیت نہیں کھوتی اور اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے متعلمینِ فلسفہ کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں اور چونکہ اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی قابلِ ذکر تصنیف موجود نہ تھی اس لئے فاضل مترجم نے ضروری سمجھا کہ اقبال کی اس اہم تصنیف کو اردو زبان میں منتقل اور محفوظ کر دیا جائے۔ ترجمہ بہت رواں اور شگفتہ ہے کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ یہ ترجمہ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں مکمل کر لیا تھا لیکن طباعت کی دقتوں کی وجہ سے ۱۹۳۶ء میں اشاعت ہو سکی۔ یہ کتاب

بھی نایاب ہو گئی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے اس کا دوبارہ شائع کیا جانا ضروری ہے

اقبالؒ

تین سو چہتر صفحات کا یہ مجموعۂ مضامین ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے مرتب کیا ہے پہلی بار اکتوبر ۱۹۳۸ء میں رسالہ اردو کے "اقبال نمبر" کے نام سے اورنگ آباد دکن سے شائع ہوا تھا اس کے لکھنے والوں میں بعض مشاہیر اہل قلم شامل ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خود ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا کوئی مضمون یا بطور مقدمہ یا دیباچہ کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ لکھنے والوں کی طویل فہرست میں اہل حیدرآباد کے بھی نام نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور دوسرے پروفیسر ابوظفر عبدالواحد[1] ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے مقالہ کا عنوان ہے "اقبال اور آرٹ" اور یہ ان کی تصنیف "روح اقبال" میں کسی قدر تبدیلی اور اضافہ کے ساتھ بعد کو شامل کر لیا گیا ہے، اور روحِ اقبالؒ کے سلسلے میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں ہم ابوظفر صاحب کے مضمون کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

ابوظفر صاحب کے مقالے کا عنوان ہے "اقبال کا ذہنی ارتقاء" اور اس کتاب کے تقریباً چالیس صفحات اس نے سمیٹ لئے ہیں، اور ابوظفر صاحب کے مخصوص طرزِ انشا کا ایک قیمتی نمونہ ہے۔ صاحبِ موصوف دورانِ تحریر میں بعض بڑے چونکا دینے والے جملے لکھ جانے کے عادی ہیں اور بعض اوقات چند بحث طلب اور خیال انگیز امور چھیڑ دینے میں ان کو لطف آتا ہے۔ مثلاً اسی مضمون میں اقبال کی ابتدائی شاعری، ماحول اور اسکے محرکات کا جائزہ لینے کے بعد وہ غالب و اقبال کا موازنہ شروع کر دیتے ہیں اور ابتدا ہی میں واضح طور پر کہہ دیتے ہیں کہ

---

[1] ابوظفر صاحب حیدرآباد کے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں حیدرآباد کے کئی معروف ادیبوں کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے آجکل اردو کالج حیدرآباد کے پرنسپل ہیں۔

"گو کہنے کو انہیں داغ سے تلمذ تھا لیکن ذہنی اور معنوی حیثیت سے وہ غالب کے شاگرد تھے، اقبال کی شاعری گویا غالب کی شاعری کا تتمہ ہے۔"

پھر آگے چل کر غالب و اقبال کے مزاج کی یکسانیت اور اقبال کے علمی پس منظر پر اظہار خیال کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"یہ جامعیت اردو کے شعرا میں تو کیا، دنیا کے باکمالوں میں بھی کم ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ غالب کی شاعری میں جو کمی تھی اقبال نے اس کو پورا کیا۔

البتہ ایک حیثیت سے اقبال کا رتبہ غالب سے گھٹا ہوا ہے۔ میں نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ "اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا ہے۔ اسی میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے"۔ فلسفہ کو شعر بنانا واقعی کمال ہے۔ غالب نے بڑی حد تک یہی کیا ہے وہ صد فیصد شاعر اور ہر رنگ میں شاعر رہتا ہے کبھی خشک فلسفی نظر نہیں آتا، لیکن اقبال بعض اوقات فلسفہ بلانے لگتے ہیں۔ یہیں ان کی شاعری واعظانہ روپ اختیار کر لیتی ہے چنانچہ ان کے آخری دور کی شاعری کا رنگ بالکل واعظانہ اور مذہبی ہے "بال جبریل" کے بعض مقامات اور "ضرب کلیم" اور "پس چہ باید کرد" کے بیشتر حصے اسی قبیل کے ہیں جہاں بے رس فلسفہ اور مذہب کا پرچار کیا گیا ہے۔"[1]

ملاحظہ فرمایا آپ نے، ان چند سطور میں کتنی متضاد اور بحث طلب باتیں بیان کی گئی ہیں ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان سطور کے لکھنے کا باعث دراصل "بانگ درا" کے دیباچہ نگار

---

[1] اردو کا اقبال نمبر صفحہ ۲۲

سر عبدالقادر کا یہ شاعرانہ خیال ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"[1]

یہ ایک شاعرانہ اندازِ بیان تھا اور "بانگ درا" کی حد تک مناسب بھی، لیکن جاوید نامہ سے لے کر ارمغانِ حجاز تک کے اقبال سے غالب کے رنگ شعر اور موضوع شعر کو کیا نسبت اور کیا علاقہ! یہ جانتے اور ماننے کے باوجود کہ اقبال سی جامع الکمال شخصیت "اردو کے شعراء میں تو کیا دنیا کے باکمالوں میں کم ملے گی" اس کی شاعری کو غالب کی شاعری کا تتمہ قرار دینا، کس لحاظ سے درست کہا جا سکتا ہے؟ غالب مزاجاً فلسفی ضرور تھے لیکن انہوں نے فلسفہ کو اقبال کی طرح علمی انداز میں باقاعدہ پڑھا نہیں تھا، نہ ان کو زمانہ ایسا ملا تھا کہ وہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی بہرہ مند ہوتے، ان کے لئے کس طرح ممکن تھا کہ وہ کوئی مستقل نظام فکر مرتب کرتے، پھر ان کے موضوعاتِ شعر میں وہ وسعت و پہنائی کہاں سے آسکتی تھی جو کلامِ اقبال کا جوہر ہے، غالب نے زندگی کو کونسا نیا فلسفہ دیا، ان کا فلسفہ و تصوف بیدل و نظیری کی بازگشت کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ وہ محسوسات و نفسیاتِ انسانی کے شاعر ہیں اور بلاشبہ عظیم ترین شاعر اور یہ بھی ایک لازوال حقیقت ہے کہ ان کا اچھوتا اور بے نظیر اندازِ بیان آج بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن ان کے موضوعاتِ شعر آفاق گیر نہیں

---

[1] بانگ درا

ان کا فلسفۂ حیات غمِ ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس ساز کے نغمے چونکا تو دیتے ہیں اور حیرت ناک طریقہ سے چونکا دیتے ہیں لیکن آمادۂ عمل نہیں کرتے۔ وہ نغمۂ جبرئیل ہی صورِ اسرافیل اور بانگِ رحیل نہیں۔ اقبال کی "جامعیت" یہی ہے کہ "غالب کے معنوی شاگرد" ہونے کے باوجود ان کا فلسفۂ حیات غمِ ذات نہیں بنتا۔ اقبال کی شاعری میں بھی حقیقت آشنا جذبات اور رنگا رنگ مشاہدات و محسوسات کی کمی نہیں لیکن یہ چیزیں ان کے ہاں شعری پسِ منظر کا کام کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک مخصوص فلسفہ کی نمائندہ اور مقصدی ہونے کے باوجود شاعری ہے، ایک عظیم اور غیر فانی شاعری، اور اس شاعری نے اس برِّصغیر میں جو ذہنی انقلاب پیدا کیا ہے اس کی مثال ہند و پاکستان میں تو کیا، دنیا کے ادب میں بھی کم ملتی ہے۔ اقبال کے آخری دور کے کلام کو ابوظفر صاحب آب و رنگ شاعری سے عاری سمجھتے ہیں اور اسے ایک بے رس "فلسفہ" و "مذہب" کی ترجمانی قرار دیتے ہیں اور ایک جگہ وہ اسی مضمون میں خود کلامِ اقبال کے مجموعوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"[1] آسکر وائیلڈ" کا قول ہے کہ فن کار کا عمل اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے جاوید نامہ اقبال کی یگانہ سرشت کا وہ بے مثل ثمر ہے جس کی مثال خود اقبال کے کلام میں اور کہیں نہیں مل سکتی ....

جاوید نامہ کے آگے ضربِ کلیم اور بالِ جبرئیل گھٹیا درجے کی چیزیں ہیں۔"

اقبال سے ایسا شغف رکھنے کے باوجود ان کے کلام کے مختلف مجموعوں کے متعلق ابوظفر صاحب کی یہ رائے نہ صرف محلِ نظر ہے بلکہ ان کی انتہا پسندی کی چغلی کھاتی ہے۔ ہماری

---

[1] اردو، اقبال نمبر صفحہ ۲۲۰، ۲۴۸

زبان کے اکثر نقادوں کا یہی حال ہے، معلوم نہیں ان حضرات کو موازنہ کی بھول بھلیاں کیوں پسند ہیں۔ ابھی ابھی موازنہ کے تیر و کمان سے لیس ہو کر غالب کو سپر بنائے محوِ گردش تھے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسے کوچہ میں پہنچ گئے جہاں ان کو خود اقبال، اقبال سے دست و گریباں نظر آنے لگا۔ "اقبال کا ذہنی ارتقاء" کے مطالعہ سے ہی ان دعوٰوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری کا لب و لہجہ اپنے موضوع کی ہمہ گیری، مقصدیت تنوع اور حالات کے اعتبار سے مختلف رہا ہے، کبھی وہ نوائے چنگ ہے اور کبھی خروش و آہنگ اور کبھی اعلانِ جنگ! شعرِ اقبال میں صرف رنگ اور رس کی جستجو بے سود ہے، البتہ اس کے کلام کا ایک ایک مصرع شاعر کے دل کی دھڑکنوں سے ضرور معمور ہوتا ہے اس میں فارسی اور اردو کا امتیاز غیر ضروری ہے۔ چونکہ ابوظفر صاحب فارسی زبان کے بڑے اسکالر ہیں اس لئے ان کو طبعاً اقبال کا فارسی کلام زیادہ پسند ہے۔ ورنہ "بالِ جبریل" کو محض فنی نقطۂ نظر سے بھی اگر اردو شاعری کا معجزہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں "ضربِ کلیم" کے متعلق خود اقبال نے راس مسعود کو لکھا تھا۔[1]

"باقی رہی کتاب، سو یہ ایک TOPICAL چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر اپنے خیالات کا اظہار کر دوں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام اور "ناظرین" سے میں نے خود کہا ہے کہ

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۸۰ و ۳۸۱

نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے اس کتاب کا REALISTIC ہونا ضروری ہے

اور نوائے چنگ کی تلافی EPIGRAMMATIC STYLE سے کی گئی ہے

ان باتوں کے قطع نظر زیرِ بحث حالاپنے مخصوص طرزِ نگارش کی وجہ سے قابلِ قدر اور

قابلِ دید ہے۔

دیگر مضامین پر تبصرہ اس لیے نہیں لکھا گیا کہ ان کے لکھنے والوں کی اکثریت حیدرآباد

سے تعلق نہیں رکھتی، خلیفہ عبدالحکیم صاحب کو ضرور نیم حیدرآبادی کہا جا سکتا ہے لیکن

ان کا مقالہ رومی، نطشے، اقبال جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے، اس سے سبھی

واقف ہیں اس لئے اس کا تذکرہ یہاں غیر ضروری معلوم ہوا۔

متاعِ اقبال

اس کے مصنف بھی ابوظفر عبدالواحد صاحب ہیں پہلے پہل جب شائع ہوئی تھی تو

اس کو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا، اب اس کا کوئی نسخہ نہ مصنف کے ہاں ہے نہ

یہاں کہیں دستیاب ہو سکا اس لئے ہم تفصیلی تعارف و تبصرہ سے قاصر ہیں۔

سب رس کا اقبال نمبر

ماہنامہ سب رس حیدرآباد کا پہلا رسالہ ہے جس نے ہندوستان گیر شہرت حاصل

کی تھی۔ اور ایک زمانہ میں ادبی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ادارہ ادبیاتِ اردو

کے اس ترجمان کی نگرانی کے فرائض ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے سپرد ہیں اور ابتدائی شمارے

صاحبزادہ میکش مرحوم اور خواجہ حمید الدین شاہد[1] کی ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ زیرِ نظر

---

[1] خواجہ حمید الدین شاہد حیدرآباد کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں اور بہت ملنسار اور خلیق، جامعہ عثمانیہ دیاتی اچھے صنوبہا

اقبال نمبر بھی انہی حضرات نے مرتب کیا تھا یہ ماہ جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ لکھنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والے بھی حیدرآباد کے یا حیدرآباد میں رہنے والے ہیں۔ اقبال کے اشعار سے متعلق تین تصویریں بھی شامل ہیں، جن میں سے ایک عبدالرحمان چغتائی کی سات رنگی تصویر ہے، خود اقبال کی دو نایاب تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں جن میں سے ایک وہ مشہور تصویر ہے، جس میں اقبال شال اوڑھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ پہلی دفعہ "سب رس" میں طبع ہونے کے بعد اتنی مشہور ہوئی کہ اب وہی مروج ہو گئی ہے ایک نادر گروپ فوٹو بھی شریک ہے جس میں اقبال، راس مسعود، سجاد حسین، ملا مس ہاشم غلام السیدین اور ڈاکٹر خالد شیلڈریک بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے چند نوجوان مخصوص حیدرآبادی شیروانیاں پہنے کھڑے ہوئے ہیں۔ اقبال کی نشست درمیان میں ہے اور راس مسعود عجب خود فراموشی کے عالم میں اقبال اور غلام السیدین کے گلے میں ہاتھ ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں لیکن مرتبین نے یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ یہ فوٹو کہاں اور کس زمانے میں لیا گیا، اور پیچھے جو نوجوان کھڑے ہوئے ہیں وہ کون اور کہاں کے رہنے والے ہیں۔

اس نمبر کے لئے حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے مشاہیر کے پیامات بھی منگوائے تھے، جن میں مہاراجہ کشن پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، اکبر حیدری، مولانا عبدالماجد دریاآبادی اور عبدالرحمٰن چغتائی قابل ذکر ہیں۔ یہاں خصوصیت سے ہم اکبر حیدری کا پیام نقل کرتے ہیں جو بہت مختصر لیکن اقبال سے ان کے خلوص بے پایاں کا مظہر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تاسیس اردو کے لکچر ارد ہ چکے ہیں۔ آجکل اردو میں سائنسی ادب پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ ان کا مرتبہ کردہ شعرائے حیدرآباد کا انتخاب حال ہی میں شائع ہوا ہے (حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ سب رس اقبال نمبر صفحہ

"اقبال جیسے فوق للانسان ہستیوں کو موت نیست و نابود نہیں کر سکتی - اگرچہ موجودہ پریشان زمانے میں اقبال خود ہماری رہبری کے لئے موجود نہیں رہے، ان کے کلام میں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے اور ہمیں اس سے سبق ملتا رہے گا - وہ دن بھی ضرور آئے گا جب ہمارا ملک بلکہ ہماری دنیا اس شاعر کے بلند پایہ خیالات پر عمل پیرا ہوگی۔"

عبدالرحمان چغتائی کے خط کے چند جملے اتنے سوز و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ جن کو پڑھ کر آج بھی اقبال کی وفات کا غم تازہ ہو جاتا ہے اور ان کے انتقال کے بعد کا لاہور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے - چغتائی صاحب نے لکھا تھا:

"جس غریب قوم کا وہ شاعر اور پیامبر تھا اس نے اس کو امید سے زیادہ اچھی جگہ دی، اس کی آرامگاہ شاہی مسجد کا دامن ہے، جس کا بانی اورنگ زیب تھا - جہاں ہزاروں مسلمان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں - شام کے وقت اتنا دردناک اور پرسوز منظر رہتا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان کی آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں کوئی اقبال کے شعر پڑھتا ہے - کوئی اس کی روح کو درود کا تحفہ بھیجتا ہے اور کوئی کلام الٰہی کا ورد کرتا رہتا ہے ...... اقبال کے چلے جانے سے لاہور کی فضا سونی ہے اور دلوں پر ایک قسم کی مردنی چھائی رہتی ہے۔"

اس نمبر کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ان جلسوں کی تفصیلات بھی اکٹھا کر دی گئی ہیں جو اقبال کی زندگی میں اور وفات کے بعد حیدرآباد میں منعقد کئے گئے تھے۔ اور اس کی وجہ خواجہ حمیدالدین شاہد نے یہ بیان کی تھی کہ آئندہ اقبال پر کام کرنے والوں کو مواد یکجا مل جائے گا — کیا خبر تھی کہ اس نمبر کی اشاعت کے تقریباً بیس سال بعد پاکستان میں اقبال کے ایک رمز شناس اور صاحبِ دل بزرگ جناب ممتاز حسن صاحب کو یہ خیال

آئے گا کہ حیدر آباد میں اقبال پر جتنا کام ہوا تھا اس سے پاکستان کو بھی واقف کرایا جائے ہماری یہ تالیف صاحب موصوف کے اسی خیال اور توجہ کا ثمر ہے اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اس کی ترتیب میں "سب رس" کے اقبال نمبر سے معتد بہ مدد ملی۔ دوسرے لفظوں میں فاضل مرتبین کی محنت رائیگاں نہیں گئی ۔۔۔!

کلیاتِ اقبال

اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ ۱۹۲۳ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا تھا اور اس کے مرتب دکن کے ایک صاحبِ ذوق عہدہ دار عبدالرزاق راشد ہیں۔ راشد کو اقبال سے غیر معمولی عقیدت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھان کر اور مختلف اخبارات و رسائل کے انباروں میں سے کلامِ اقبال کو یکجا کر کے انہوں نے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا اور اہل وطن کے بہم اصرار اور خود اپنے جوشِ ارادت سے مجبور ہو کر "بانگ درا" سے بہت پہلے شائع کر دیا۔ اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ غالباً اس کی اشاعت کی باقاعدہ اجازت اقبال سے حاصل نہیں کی گئی تھی، چنانچہ "کلیات" کے چھپنے کے بعد اقبال نے مرتب کو قانونی چارہ جوئی کا نوٹس بھی ہم نے سنا ہے کہ اسی وجہ سے دیا تھا لیکن اکبر حیدری کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے یہ قضیہ ختم ہو گیا تھا، کیونکہ "کلیات" کی اشاعت سے مرتب کا مقصود جلبِ منفعت نہیں تھا اور ویسے بھی اس وقت تک مصنفین کے حقوق کے تعلق سے کوئی روایت قائم ہی نہیں ہوئی تھی عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں اس روایت کی بنیاد بھی کلامِ اقبال کی اشاعت ہی سے پڑتی ہے، ورنہ اس سے قبل ناشر عموماً مصنف کے ممدوح ہوتے تھے اور ان کی نظم و نثر کی اشاعت ہی ان غریبوں کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہوتی تھی، بہر کیف اس دلچسپ واقعہ کے قطع نظر "کلیاتِ اقبال" بڑے اہتمام سے شائع کی گئی تھی۔ اس کا حجم (۲۹۶) صفحات ہے۔ اعلیٰ قسم

کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ اور سائز بھی "بانگِ درا" سے بڑا ہے۔ اب اس مجموعے کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ اس میں اقبال کی بہت سی ایسی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جو نایاب ہو گئی ہیں اور جن کو خود اقبال نے یا تو بانگ درا میں شامل نہیں کیا ہے یا شامل کیا ہے تو ان کی صورت ہی بدل دی ہے۔ شاعر کی ذہنی تبدیلی و تدریجی ترقی کے مطالعہ کے لئے اس میں کافی مواد مل جاتا ہے اور جدید تنقید و تنقیح کے لئے ایسا مطالعہ دلچسپ ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ اس مجموعہ کی دوسری اہم بات خود مرتب کا ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے اور جسے ہم بلا تامل کلامِ اقبال پر پہلا سیر حاصل تبصرہ کہہ سکتے ہیں، بعد میں اقبال پر جو کچھ لکھا گیا اور اس سلسلے میں جو شاندار عمارت تیار ہوئی یقیناً یہ اس کی خشتِ اول ہے۔ اس دیباچہ میں اقبال کے تعلق سے بعض ایسے اہم اور دلچسپ واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے اور نئی نسل تو ان سے واقف ہی نہیں ہے۔ خلا اقبال کے بارے میں وقار الملک کے خیالات اور آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر ۱۹۰۷ء میں شبلی کے ہاتھوں اقبال کی گلپوشی کا واقعہ، یہ سب باتیں اہم ہیں اور ضرورت ہے کہ جدید نسل کو بھی ان سے واقف ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔ عبدالرزاق راشد مستحق مبارکباد ہیں کہ ان کی عقیدت و ارادت نے متعلمینِ اقبال کے لئے ایک اہم تاریخی دستاویز "کلیاتِ اقبال" کی شکل میں فراہم کر دی ہے "کلیات" اب نایاب ہو گئی ہے، اس کی دوبارہ اشاعت کی طرف اقبال اکیڈمی کو توجہ کرنی چاہیئے۔

نظم اقبال، سفر حیدرآباد دکن اور تاثرات ۱۹۱۰ء میں

یہ کتابچہ تصدق حسین تاج نے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا تھا، یہ کتابچہ اقبال کی دو نظموں اور سر عبدالقادر کی اور خود اقبال کی لکھی ہوئی تمہیدوں پر مشتمل ہے اور انہیں رسالہ "مخزن" شمارہ

جون ۱۹۱۰ء سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ نظموں کے عنوانات ہیں "شکریہ" اور "گورستانِ شاہی"
"شکریہ" کو آپ "مہاراجہ کشن پرشاد اور اقبال" والے باب میں ملاحظہ کریں گے اور "گورستان شاہی"
معمولی سی تبدیلی کے بعد "بانگِ درا" میں شامل کی گئی ہے۔ یہ نظم کن حالات میں لکھی گئی اس
کی تفصیل شیخ عبدالقادر کی زبانی سنئے۔

"اس نظم کے میسر آنے کے لئے ہم اپنے قدیم عنایت فرما مسٹر حیدری کے ممنون ہیں
جن کے صحیح مذاقِ علمی نے شیخ محمد اقبال صاحب کو حیدر آباد میں وہ چیزیں دکھائیں جو ایک
خلقی شاعر کے دل پر قدرتی طور پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ سلاطینِ قطب شاہیہ
کے مزار، ان کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شبِ ماہ مگر ایسی شبِ ماہ جس میں
بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی ہیجے
شاعرانہ جذبات کے نشو و نما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان اور کیا ہو گا"

اس کتابچہ کے ذکر کے ساتھ مطبوعات کا باب ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال سے متعلق حیدر آباد
کی شائع کردہ جتنی کتابیں ہم کو یہاں کراچی میں مل سکیں ان کی تفصیلات تبصرہ و تعارف کے
ساتھ پیش کر دی گئی ہیں۔ اور منتشر مضامین کی تعداد تو شمار سے باہر ہے اور ان کا میسر آنا
ناممکن ہے اس لئے صرف یادداشت سے ان کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوا۔

جن مطبوعات پر بحث و گفتگو ہوئی وہ ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً سب کی سب انقلاب
حیدر آباد سے پہلے کی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۸ء کے بعد بھی وہاں اقبال پر کام ہوا ہو۔
لیکن اس کا ہمیں علم نہیں۔ لہٰذا مجبوراً اس باب کو ہم تشنہ ہی ختم کرتے ہیں۔

شعرائے حیدرآباد اور اقبال

شاعری کی دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور اس عنوان پر بحث و گفتگو میں چراغ پا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک فطری شاعر متقدمین اور ہم عصر شعراء سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن ان کا نقال نہیں بنتا یہی وجہ ہے کہ "طرزِ بیدل میں ریختہ کہنے کو قیامت" سمجھنے اور ایک عرصہ دراز تک اس طرز کو نبھاتے رہنے کے باوجود غالبؔ غالب رہے اور اقبال اوجِ کمال پر پہنچنے کے بعد مولانا رومؒ کو اپنا پیر بنا لیتے ہیں پھر بھی اقبالؔ ہی رہتے ہیں، فطری شاعر اور عہد آفرین شاعر میں ایک نازک سا فرق ہوتا ہے۔ فطری شاعر اپنی ذہانت اور طباعی کے ساتھ ساتھ اگر ایک نیا لہجہ اور طرزِ بیان بھی رکھتا ہے تو اس کے اثرات بھی لہجہ و بیان تک محدود رہتے ہیں لیکن عہد آفرین شاعر لہجہ و بیان کے ساتھ ساتھ اپنے قاری کی اسپرٹ کو بھی متاثر کرتا ہے۔ وہ دلوں میں تلاطم ہی نہیں پیدا کرتا ذہنی انقلاب کا بھی باعث ہوتا ہے! بلاشبہ اقبال ایک عہد آفرین شاعر تھے، اقبال کے معاصرین، متاخرین اور مقلدین میں بڑے شاعروں کی کمی نہیں اور اسی لئے اس دور کو اردو شاعری کا عہد اقبال بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن ان کی اکثریت فطرت کی فیاضیوں پر قانع رہی سان میں سے اکثر "دل سے دل کو ٹکرانے" ہی کو شاعری سمجھتے رہے۔ بعضوں

نے اس تنگنائے سے قدم باہر نکالا بھی تو اس طرح کہ وقتی سیاسی تحریکات کے دھاروں میں بہہ گئے۔ وقتی طور پر ایک غلغلہ ضرور بلند ہو گیا لیکن ان آوازوں میں کوئی آواز ایسی نہیں جس کے متعلق کہا جائے کہ

ع پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت!

اقبال کی عہد آفرین شاعری بڑی اقبال مندی تھی، اس نے اپنے ہم عصروں اور پیچھے آنے والوں ہی کو نہیں بلکہ پیش روؤں کو بھی متاثر کیا۔ اکبر کا یہ اعتراف ملاحظہ کیجیے۔

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور[1] ہر حرف سے ہے تجلّیِ حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کلبۂ عالم ہر لفظ ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور

اور اپنے وقت کے ایک مشہور عالم، مورخ اور فلسفی علامہ عبداللہ عمادی لکھتے ہیں۔

"[2]ہندوستان میں جس وقت بیداری کے دوسرے معنی خوابِ غفلت تھے جب اسلامی جذبات کے مضحکے اڑائے جاتے تھے، جب قومیت کا احساس موجود ہی نہ تھا، اس وقت سب سے پہلے اسلام کے جس فردِ کامل نے اعلائے کلمۃ اللہ کا آوازہ بلند کیا اور اس صور اسرافیل کو تا فلک پہنچا دیا، وہ ڈاکٹر اقبال کی پاک ہستی تھی جو حقیقت میں تحریک حریت اسلامی کی من حیث الشرع والدین اولین محرک ہے، اکبر، آزاد، ظفر، محمد علی، شوکت علی سب اسی خرمن کے خوشہ چین ہیں اور سب کے دلوں میں اسی کی تعلیماتِ صدق و صفا سے گرمی پیدا ہوئی ہے۔"

اقبال[3] کے اعترافِ کمال کے سلسلے میں وہ جلسہ بھی یادگار ہے جو ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق راشد مطبوعہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۰ [2] کلیاتِ اقبال صفحہ ۵ علوی صاحب رکن دار الترجمہ تھے [3] کلیات اقبال ص ۴۰

کانفرنس کے موقع پر دہلی میں منعقد کیا گیا تھا، اس جلسہ کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواری جیسے بزرگ نے فرمائی اور اقبال کی گلپوشی کی رسم شبلی نے ادا کی، اس خوشگوار فریضے کو ادا کرتے ہوئے شبلی نے کہا تھا۔

"یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہیئے ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطاب کی قدر کرتے رہے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی۔ محقق طوسی وغیرہ کو اس زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دیئے لیکن آج سوا کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے، لیکن قوم کی طرف سے "محقق" کا جو خطاب دیا گیا وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے۔ اور حقیقت میں وہ اس کے مستحق ہیں۔"

اس جلسے کے کچھ عرصہ بعد وقار الملک نے نصف صدی اُدھر کی شاعری اور قوم پر اس کے اثرات اور مولانا حالی کی مسدس کا ذکر کرنے کے بعد مؤلف کلیات اقبال سے کہا تھا۔

"ایک اور بیرسٹر صاحب شیخ محمد اقبال نامی لاہور میں رہتے ہیں، تو می شاعر ہیں۔ ہم کو آجکل ایسی ہی فائدہ مند شاعری کی ضرورت ہے جیسی کسان کی ہے ــــــ ان کو چند ہی روز ہوئے کہ دہلی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے پھولوں کے ہار پہنائے گئے ...... قوم نے ان کی قابلیت کی کتنی بڑی عزت کی ...... ان کا ایک ترانہ "چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا" آجکل ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہے[۱]"

---

[۱] کلیات اقبال صفحہ ۴۶

مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ان کی نظم شکوہ بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے گا گا کر پڑھتے ہیں۔

...... ڈاکٹر اقبال کے سے قابل افراد قوم میں پیدا ہوں تو یقیناً ہماری قوم کی عزت بڑھے گی۔

ملاحظہ کیا آپ نے، یہ باتیں ہیں جب کی کہ اقبال جوان تھے اور ان کی شاعری کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور وہ ادب کے اسٹیج پر ایک اجنبی کی طرح نمودار ہو رہے تھے لیکن کیسے کیسے کہن سال اور دقیقہ سنج اکابر نے ان کی پذیرائی کی،

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

اقبال نے اپنی شاعری کا پیکر جن عناصر سے تراشا اور ایک مستقل نظامِ فکر کے ساتھ جلال و جمال اور شعریت و نغمگی کے امتزاج سے اس کے خط و خال کو جس طرح ابھارا اس کی مثال مشرق ہی نہیں مغرب میں بھی کم ملتی ہے، شعرِ اقبال جن عناصر سے مرکب ہے ان میں حرکت و عمل، بے نیازی و خودشناسی اور ایثار و عطا سب نمایاں ہیں، لیکن اس ساری حرکت و عمل، بے نیازی و خودشناسی اور ایثار و عطا کے پیچھے نطشے کا درسِ خون آشامی، ہند و فلسفیوں کی تعلیم ترکِ دنیا اور صوفیوں کی دعوتِ بے عملی کی پرچھائیں تک نہیں، اس کی فکرِ بلند عشق کے پر لگا کر فضائے بسیط میں پرواز کرتی ہے اور تازگیٔ عمل اور بلندیٔ کردار کی روشنیوں کو روحِ انسانی کے عمیق گوشوں تک پہنچا دیتی ہے اس کا عشق غالبؔ کی وہ آتشِ عشق نہیں کہ ع جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے اس کا عشق صدقِ خلیلؑ اور صبرِ حسینؑ کی درخشندہ سنتوں سے ترکیب پاتا ہے۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق!

یہی عشق تاریخ کے ہر دور میں آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑا ہے اور اسی آگ سے اس نے اندازِ گلستاں پیدا کیا ہے، یہی وہ عشق ہے جو پاسبانِ عقل کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے اس لئے نہیں کہ تکمیلِ ہوس کی خاطر ایٹم برسا کر دنیا کو جہنم بنائے بلکہ اس لئے کہ وہ

مظاہرِ قدرت پر قبضہ کرے، فضائے بسیط پر چھا جائے، سیاروں کی سیر کرے اور ستاروں کو اپنے قدموں سے روند ڈالے،

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

یہ عشق اس علم، اس حکمت، اس تدبر و حکومت کا باغی ہے جو
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

عشقِ اقبال کے اس فیضان سے دیگر اقطاعِ ہند و سندھ کے اکابر او رمقلدین کی طرح دکن کے شعراء بھی متمتع ہوئے — اور کچھ زیادہ ہی ہوئے۔ اقبال کی شاعری اسلامی اقدار کے احیاء کی محرک اور علمبردار رہی ہے، اور ان اقدار کو وہ ساری انسانیت کی نجات کا باعث سمجھتی ہے یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد میں اس شاعری کا شایانِ شان استقبال ہوا، اقبال کے ہم عصر اور

ان کے روشناس خلق ہونے کے کچھ عرصے بعد متعارف ہونے والے شعراء میں حیدرآباد کے توفیق، کیفی، امجد اور علی اختر کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے کچھ پہلے جو شاعر ابھرے ان میں عظمت اللہ خاں، علی منظور، تمکین سرمست، طاہر علی خاں مسلم، فضل الرحمان اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جن شعراء نے شہرت پائی ان میں آرام، رشدی، اشک، امیر، اکبر، باقی، بدر، رشید، وفا اور شکیب قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے بعد شعراء کی جس نسل کی نغمہ سنجیوں سے حیدرآباد کی محفلیں گونج اٹھیں ان میں ماہر، تابش، مخدوم، وجد، ساز، حزیں، شاہد، حسرت، تسنیم، بیکش، دہقانی، جامی کھٹا، سعید اور کاوش کے ناموں کو گنوایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد جن شعراء نے اپنے کمال کا سکہ جمایا ان کی فہرست طویل ہے اور اریب، تحسین، کنول، مجیب اور ساجد سے شروع ہوکر شاعر، شاذ، تاب، عروج، انور اور وحید اختر پر ختم ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا شعراء کی اکثریت اقبال کے کمال کی معترف اور مخدوم کے اس خیال سے متفق ہے کہ

نغمہ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں

صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

توفیق مومن کی طرح نازک خیال شاعر تھے اور اقبال کے ہم عصر، اقبال کی ایک مشہور غزل سے متاثر ہوکر بڑے معرکہ کی غزل کہی تھی، مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں

کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں

یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حیرتیں چھا گئیں

کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہِ آئینہ ساز میں

مولانا سلیمان ندوی نے امجد کو "حکیم الشعراء" کا خطاب دیا، لیکن کلام امجد میں حکمت و رموز کی تلاش کچھ ضروری نہیں، ویسے بادۂ عرفان کی اس جام میں کمی نہیں، اور اس کی سادگی اور تاثیر سے انکار مشکل ہے، اقبال نے کہا تھا۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

یہی راز امجد کی زبان سے یوں فاش ہوا ہے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے ۔۔۔ کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے

ظالم ہی، جاہل ہی، نادان سہی ۔۔۔ سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

کیفی داغ کے شاگرد اور ٹھیٹ غزل گو شاعر تھے، لیکن حالی اور اقبال کے پیام بیداری نے ان کو بھی چونکایا اور آخر آخر میں ان کی شاعری قوم کی اصلاح کیلئے وقف ہو کر رہ گئی۔

بڑی جنلب ہے رندانِ پاک طینت کی

ادب سے دور کھڑی رہتی ہے ندامت بھی (کیفی)

یہی ندامت کام آگئی اور آخر کار وہ اس طرح دعا مانگنے لگے۔

اللہ مرا دامنِ مقصد بھر دے ۔۔۔ تو رائی کو گر چاہے تو پربت کر دے

کچھ اسکے سوا میری نہیں ہے خواہش ۔۔۔ غفلت کے مرے دل سے اٹھا لے پردے

حیدرآباد کے اس دورِ شاعری میں علی اختر کی آواز سب سے الگ اور بلند آہنگ ہے۔ ان کے مخصوص لب و لہجہ اور مفکرانہ انداز بیان نے انہیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد اور نمایاں جگہ دی ہے، بقول نیاز فتحپوری انکا شمار شاعری کی جدید راہ میں شمع ہدایت روشن کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ زندگی کے متعلق اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ رکھنے کے باوجود وہ اقبال کے

بڑے طراح تھے اوراق پر دو بڑے معرکہ کی نظمیں کہی ہیں جو اسی کتاب کے اوراق میں آپ کی نظر سے گذریں گی۔ اقبال کا پیامِ عمل علی اختر کے اپنے انداز میں اس طرح پیش ہوتا ہے۔

روح کی تعمیر ہے بیداریِ سعی و عمل — صف بہ صف ہو جو نکے جز رو مد میں کھلتا ہے سکوں

سینۂ انساں ہے اک دریائے ناپید اکنار — جس کی وسعت میں ہیں بے اندازہ موجیں بیقرار

اہلِ ہمت حلقۂ امواج میں رہتے نہیں — رخ بدل دیتے ہیں طوفانوں کا خود بہتے نہیں

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے قبل جو شاعر سامنے آئے وہ زیادہ تر عظمت اللہ خاں کے زیر اثر ہندی بحروں کی آمیزش سے اردو شاعری میں نت نئے تجربے کرتے رہے، ان کی یہ سعی مشکور ہوئی یا نہیں اس کے متعلق اظہار رائے کا یہ موقع نہیں البتہ ان کے اثرات قیامِ جامعہ کے فوری بعد متعارف ہونے والے شعراء پر ضرور پڑے، خاص طور سے حبیب اللہ رشدی اور اکبر وفاقانی کی نظموں میں کہیں کہیں ان تجربات کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ قاضی آرام، جلال اللہ اشک عبدالقیوم باقی، رشید ترابی، ابوالکلام بدر، محمد امیر اور بدرالدین شکیب کی شاعری اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ بحروں کا انتخاب، الفاظ کی نشست اور ترکیبوں کا دروبست قدم قدم پر چغلی کھاتا ہے کہ یہ "بانگ درا" کی صدائے باز گشت ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس شاعری میں ایک نیا اور اچھوتا پن بھی ہے اقبال کے اثرات ضرور ہیں محض نقالی نہیں نئے نئے عنوانات کے ساتھ کچھ نئی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں، مثلاً ابوالکلام بدر کی نظم "ریل گاڑی" میں (جو مجاز کی نظم "ریل گاڑی" سے کم از کم پندرہ سال پہلے کہی گئی تھی) اس طرح پیامِ عمل دیا گیا۔

ہے اس کا تڑپتا ہوا دل شعلۂ مضطر — شوریدہ سر ایسی کہ قیامت لئے سر پر

مجنوں کی طرح صبح و مسا پھرتی ہے بن بن — کہسار پہ دیکھو تو ہے پھنکارتی ناگن

وہ کوہ سے اتری تو ترائی میں در آئی　　کھیتوں سے گزرنے لگی پُل سے اُتر آئی

دم بھر میں گزر جائے پرے دشت و جبل سے　　رفتار میں ہے تیز قدم پیکِ اجل سے

صرصر ہو مقابل تو ہوا اس کی نہ پائے　　بادل جو رواں ہو تو یہ سایہ میں نہ آئے

نازک کمر ایسی کہ لچکتی رہے ہر دم　　ہے سینۂ بیتاب میں اک کوہ کا دم خم

اس کشمکشِ دہر میں دلشاد ہے کتنی　　یہ طوق و سلاسل میں بھی آزاد ہے کتنی

یوں آہنی آثارِ عمل چھوڑ کے جاؤ

جو مٹ نہ سکیں نقشِ قدم ایسے جماؤ

اقبال کی مشہور فارسی نظم کو جلال الدین اشک نے اس طرح اردو میں منتقل کیا ہے۔

ہشیار رہو اب رنگ بدلنے کو ہے عالم　　اٹھ دیکھ نظر آنے لگا نیرِ اعظم

پھیلا ہوا کرنوں کا زمانہ پہ ہے پرچم　　ہاں رات کی وہ بزم ہوئی درہم برہم

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

ترکشِ مارا خدنگِ آخریں، اقبال کی نظر نے اسلامیانِ ہند کو بتایا کہ ملت کے ترکش کا آخری تیر ٹیپو تھا۔ اسی ٹیپو کے متعلق اکبر دفاتانی کہتے ہیں۔

وہ بھی کوئی جلوہ تھا جو طور پہ رہ جاتا　　یا تیغ کا تقوی تھا جو حور پہ رہ جاتا

ٹیپو کا دلِ مسلم کونین کا حامل تھا　　کس طرح یہ ممکن تھا یسور پہ رہ جاتا

دنیا بھی ملی اس کو عقبیٰ کی حکومت بھی

اک دار میں حاصل کی شہرت بھی شہادت بھی

ٹیپو کے دل کو "دلِ مسلم" کہنا اقبال ہی کا فیضان ہے۔

عبدالقیوم باقیؔ نے نثر میں بھی اقبال پر بہت کام کیا تھا اور ان کی شاعری پر بھی اقبال کے اثرات بہت واضح طور پر ملتے ہیں، باقیؔ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، جون و ستمبر ۱۹۳۱ء کے مجلۂ عثمانیہ میں ان کی ایک فارسی نظم شائع ہوئی تھی جو اقبال کی مشہور نظم "محاورہ مابین یزداں و شیطان" کے انداز میں لکھی گئی تھی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زخاک آفریدی گلستانِ عالم — بہشتِ بریں راز خواب آفریدم

بہر آفتابے جہانِ کشادی — زہر ذرۂ آفتاب آفریدم

سکونے نہادی بہ ہر موجِ دریا — بہ ہر لختِ دل اضطراب آفریدم

رشید ترابی کی شہرت ایک عالمِ دین اور سحر بیان مقرر کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انہیں شعر و ادب سے بھی کافی شغف رہا ہے "شکوۂ اقبال" کا جواب انہوں نے بھی لکھا تھا، یہ مسدس بھی شکوہ ہی کی بحر میں ہے اور کافی طویل بھی ہے نمونتاً ایک ابتدائی بند پیش کیا جاتا ہے۔

ناگہاں آئی صدا کان میں قدرت میری — مجھ سے بندہ مرا کرتا ہے شکایت میری

خیر گھیرے ہے غضب کو مرے رحمت میری — صاف دل سے ہے یہ شکوہ بھی عبادت میری

آج تیرا یہ عمل مجھ کو بھی محبوب ہوا

غیر سے میری شکایت جو نہ کی خوب ہوا

بدرالدین شکیبؔ مناظرِ قدرت سے زیادہ مانوس ہیں اور ان کی نظموں میں اقبال کی ان نظموں کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں، جو انہوں نے قیام یورپ کے زمانے میں کہی تھیں شکیبؔ کی "حسین ساگر کی شام" پڑھنے کے بعد اقبال کی نظم "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" بے ساختہ یاد آجاتی ہے۔ شکیبؔ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

فطرت پہ ہے بے خودی سی طاری　　مائل بہ سکوت فضا ہے ساری

خورشید کا خونِ آرزو ہے　　دامن مغرب کا شعلہ رُو ہے

خاموشی ہے کتنی روح پرور　　آسودگی چھا گئی جہاں پر

دن رات میں جذب ہو رہا ہے

اپنی ہستی کو کھو رہا ہے

شکیب کے تذکرے کے ساتھ ان شعراء کی فہرست تمام ہوتی ہے جو پہلی جنگِ عظیم سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد دنیائے ادب میں متعارف ہوئے۔ اس دور کی نوجوان نسل کا ذہن جن حالات سے دوچار تھا ان میں تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے علاوہ قیامِ جامعہ عثمانیہ کا انقلابی واقعہ بھی تھا جس نے ان شعراء کو پرانی ڈگر کو چھوڑ کر نئی شاہراہ پر گامزن ہونے پر مجبور کیا لیکن اس پورے کارواں میں رہبری کا درجہ امجد، علی اختر اور عظمت اللہ خاں ہی پا سکے اور اپنی منفرد حیثیت کو منوا سکے، اقبال نے نئی نسل کو متاثر ضرور کیا لیکن یہ اثرات چند نئے تجربات تک محدود رہے دوسرے لفظوں میں تجربات کا یہ سرمایہ عبوری دور کا ایک شجرِ سایہ دار ضرور ہے لیکن بے ثمر، اس کی وجہ یہ ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ نے ان شعراء کو موقع ہی نہیں دیا کہ وہ شعر کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے اختیار کرتے۔

سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد یعنی دوسری جنگ عظیم سے دو چار سال قبل جو شاعر حیدرآباد میں متعارف ہوئے، ان کی فہرست بہت زیادہ طویل نہیں لیکن اہم ضرور ہے۔ اہم اس لئے کہ یہ شاعر اپنے پیش رؤوں کے مقابلے میں بالکل مختلف حالات سے دوچار تھے۔ دنیا مختلف نظریات کی شقوں میں بٹ چکی تھی، مغربی جمہوریتوں اور مارکسزم کی آویزشیں رنگ لانے لگی تھیں، فاشزم کا عفریت دنیا کو نگل جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، ہندوستان میں سیاسی تحریکات کا تلاطم کانگرسی حکومتوں کی شکل میں

مائل بہ سکون تھا، مزدور تحریکیں اپنی صفیں درست کر رہی تھیں، مسلم لیگ میدانِ عمل میں آ چکی تھی۔ اور دو قومی نظریہ کی داغ بیل پڑنے لگی تھی، اور ریاستوں میں وفاق کی رحمتوں اور زحمتوں کے تذکرے گھر گھر ہونے لگے تھے۔ ادب میں ترقی پسندی کے نعرے کا آغاز ہو چکا تھا اور انگارے کی چھوٹ دور دور پڑنے لگی تھی۔ سیاست کی طرح ادب میں بھی گروہ بندیوں کی ابتدا ہو چکی تھی ایسے ہوش آزما زمانے میں اقبال نے "عہدِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ" کیا اور "ضربِ کلیم" نے بہت سے ذہنی بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ لیکن حیدر آباد میں جو شاعر سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مختلف سمتوں میں چل پڑے تھے ان کا پلٹنا تو محال تھا لیکن یہ بھی اقبال کا اعجاز تھا کہ ان کے ذہنوں پر بھی اس نے اپنے نقوش ثبت کئے ہیں مثلاً حیدر آباد میں کمیونزم اور ترقی پسندی کے داعی مخدوم محی الدین اقبال سے اس درجہ متاثر رہے کہ انہوں نے اس پر مضامین اور نظمیں لکھیں اور اس کے فن کے متعلق بعض بڑی شاندار تقریریں کیں، اس دور کے شعرا میں فکرِ اقبال سے قربت کی سعادت سب سے زیادہ سکندر علی وجد کو حاصل رہی۔ وجد کی شاعری میں اقبال اسی مرتبہ پر فائز ہیں جس مرتبہ پر پیر رومیؒ خود اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

ماہر القادری کو شعرائے حیدر آباد کی صف میں اس لئے گنا جاتا ہے کہ ان کی شاعری وہیں جوان ہوئی اور پروان چڑھی اور انہوں نے وہاں کے ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا اور خود ان کی شاعری نے اس ماحول پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ماہر ہلکی پھلکی غزلوں اور حسن و شباب کے شاعر تھے لیکن عارف ہندی کے گہرے مطالعہ نے انہیں بالآخر اس راستے پر ڈال دیا جس پر چل کر شعر کی زندگی غیر فانی ہو جاتی ہے!

نذیر دہقانی دکن کی مقامی بولی کے شاعر ہیں اور خاص و عام میں بہت مقبول، ان کی عام فہم شاعری نے ملت کی بیداری میں بڑا کام کیا ہے، اقبال کا پیامِ بیداری انہی کی دکنی

شاعری کے ذریعہ حیدرآباد کے ہر ضلع اور ہر گاؤں میں بلکہ پورے جنوبی ہند میں پہنچ گیا تھا، ان کے شعر کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے

زمانہ ایک تھا تلواراں کے چھاں واں میں چمکتے تھے
تمہیں نینداں میں اب اکدم چمک رئیں ہیں تھُت تمارے کی

تلواراں دکن کی دیہاتی بول چال میں تلوار کی جمع، چھاں واں، چھاؤں کی اور نینداں نیند کی جمع ہے۔ "تھُت تمارے کی" ایک مقامی محاورہ ہے جو افسوس اور شرم دلانے کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "ایک زمانے میں ہم تلواروں کی چھاؤں میں چمکتے تھے، یعنی شہرت اور سکون پاتے تھے، افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ اب ہم خوابوں میں بھی ڈر جاتے ہیں"۔ دہقانی کے اس خیال کا محرک دراصل اقبال کا یہ مصرعہ ہے۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں

اس زمانے کے دیگر شعرا کے ذہن و فکر کی اقبال سے وابستگی کا تعارف خود ان کی وہ نظمیں کرائیں گی جو انہوں نے اقبال پر لکھی تھیں اور یہ نظمیں آپ کی تسکین ذوق کے لئے اسی باب میں شامل کر دی گئی ہیں۔

اقبال

شرف زیارت اقبال کا ملا مجھ کو	حریفِ ہوش و خرد تھا مزایہ عالم خواب
وہی شگفتہ مزاجی، وہی جمال ان کا	وہی نگاہ، وہی دلپذیر طرزِ خطاب
کہا یہ میں نے کہ اے آشنائے سرِ عمیق	تری نگاہ حقیقت شناسِ خوب و خراب

ا؎ سب رس اقبال نمبر

جو تو نے مطربِ پاکیزہ لحن چھیڑی تھی   ہنوز زندہ ہے وہ سوزِ نوائے رباب

خزاں پرستیٔ اربابِ دہر کیا کہیے   کھٹک رہا ہے نظر میں ترے چمن کا گلاب

کسی کو وہم کہ موضوع ہے ترا مذہب   ترا خیال ہے مسلم کے عہدِ رفتہ کا خواب

گماں کسی کو کہ تیری زباں ہے بے تاثیر   عروسِ فکر کے رخ سے ہٹا نہیں ہے نقاب

میں تیری فکر کا محرم سہی مگر دنیا!

تجھی سے چاہتی ہے نکتہ چینیوں کا جواب

سنا یہ مجھ سے تو اقبال مسکرانے لگے   پھر اپنی خاص ادا میں مجھے دیا یہ پیام

یہ پیرِ مکتبِ ناآگہی کے حلقہ بگوش   سمجھ سکیں گے ابھی کیا مری خودی کا مقام

مجھے نقیبِ حرم کہہ رہے ہیں وہ ناداں   دماغ بتکدہ جن کے تصوراتِ اصنام

مرے جہان کا ہر ذرہ عالمِ انوار   یہ آب و خاک میں سمجھے ہیں زندگی کا نظام

مقامِ نور و سرور و حضور کیا جانیں   یہ دانتے کے پرستار نیطشے کے غلام

وہ جلوہ پردۂ فاؤسٹ میں نہیں ملتا   دیا ہے عارفِ رومی نے جسکو منظرِ عام

مرا بیاں ہے حقیقت کا ترجماں لیکن!   مری زبان ہے ناآشنائے نطقِ عوام

حقیقتِ ابدی ہے تہِ نقاب ہنوز   تہی پڑے ہیں بہت دن سے ظرفِ بادہ و جام

مگر بساط الٹنے کو ہے زمانے کی   نئے نظام کی تمہید ہے کشاکشِ عام

فضائے دہر میں طوفاں کی آمد آمد ہے!

کہ بطنِ موج میں تازہ ہوا ہے ذوقِ خرام

علی اختر

پیامِ اقبالؒ[۱]

دم بہ دم نالہ نہ کر مثلِ سپند — آتشِ غم کا مداوا زہرِ خند

فرضِ انساں سعی و صبر و ذکر و فکر — چند روزہ زندگی کے کام چند

ہر مسرت آشکارا جبرِ کار — ہر مصیبت ایک پنہاں تلخ پند

طالبِ حق مطمئن مستِ عمل — طالبِ زر، خوار و مایوس و نژند

نورِ ایماں باعثِ آرامِ جاں — بے یقینی وجہِ صد رنج و گزند

زورِ بازو آزمانے کے لئے — ڈال مہر و ماہ و انجم پر کمند

دوسروں کی آنکھ سے دنیا نہ دیکھ — رہنما اپنی نظر، اپنی پسند

جسم کی پابندیاں کچھ بھی نہیں — رکھ تخیل کو سدا بے قید و بند

مردِ مومن کی متاعِ زندگی — سادگی، فکرِ رسا، عزمِ بلند

جستجو میں گرمیٔ برقِ تپاں — گفتگو میں کیفِ روحِ شہد و قند

فاش کر دیتی ہے اسرارِ حیات — سو دلبتاں اک نگاہِ ہوشمند

سکندر علی وجد

نغمۂ اقبال

تیرگی میں یاس کی اے مطربِ آتش نوا — تیرا نغمہ بخشتا ہے زندگی کا حوصلہ

کس قدر ہے حیرت افزا تیرا اندازِ ادا — آ رہی ہے قلبِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا

تیرے آگے فق ہے چہرہ رنگِ صبح و شام کا

تیرا نغمہ آئینہ ہے سیرتِ ایام کا

---

[۱] آفتابِ تازہ (مجموعۂ کلامِ وجد)

تیرا نغمہ برق آسا اضطرابوں کا پیام — صبحِ فردا کی بشارت آفتابوں کا پیام

ساحلِ پیری پہ طوفانی شبابوں کا پیام — ذہنِ قدرت کی تمنا انقلابوں کا پیام

اک ستارہ زندگانی کی اندھیری رات میں

چشمۂ حیواں ہو جیسے حلقۂ ظلمات میں

یوں تو اہلِ شوق سے خالی رہی کب انجمن — یوں تو کب بے شمعِ سینہ تھی شبستانِ سخن

یوں تو کب پھیلا نہیں افسانۂ سرو و سمن — پھر بھی بیرونِ چمن جانا نہ تھا رازِ چمن

کوئی نالہ جب بھی نکلا تیرے سازِ چنگ سے

مل گیا ہے نغمۂ جبریل کے آہنگ سے

محفلِ شرق میں کوئی نغمہ نگار ایسا بھی ہے — کیا کسی مطرب کا نطقِ شعلہ بار ایسا بھی ہے

سوز و سازِ زندگی کا رازدار ایسا بھی ہے — بول اے دنیا کہ فخرِ روزگار ایسا بھی ہے

ان نواؤں میں نہ جانے کیسا درد و سوز ہے

جن کا اندازِ جنوں تک بھی خرد آموز ہے

نظر حیدرآبادی[1]

بال[1]

بزمِ شرق تھی فسردہ چپ تھا ہر تارِ رباب — قصرِ بیداری پہ تھی چھائی ہوئی تنویرِ خواب

تھے بہ ہیکلِ خاک کی دھندلی جبیں کے خد و خال — ڈھل رہی تھی رات کے سانچے میں صہبائے جمال

تیرگی ہی تیرگی تھی شمعِ رخشاں تھی اداس — حسن کا رنگیں تبسم ہو چکا تھا نذرِ یاس

مضطرب تھی سینۂ گیتی کی روحِ تابناک — مہرِ انور سورۂ تاریک تھی تعمیرِ خاک

---

[1] سب رس اقبال نمبر

عشق کے مفہوم سے واقف نہ تھی یہ کائنات — مہر و مہ کی شب فروزی میں نہ تھی پہلی سی بات

سو رہی تھی قلزمِ ہستی میں موجِ ارجمند — رازِ انوارِ خودی سے بے خبر سیلِ بلند

گرم پہ تھیں اک نالۂ توفیق کی انگڑائیاں — آہ تھیں وہ بھی مگر محوِ فلک پیمائیاں

اس فضائے درد میں آئی وہ آوازِ گداز — لوحِ مشرق مسکرائی، جاگ اٹھے خاک باز

نزہت و انوار کی زلفیں بھی لہرانے لگیں — بدلیاں، رقصِ خودی کی دہر پہ چھانے لگیں

عشق کے ماتھے پہ نورانی پسینہ آ گیا — حسن ساحل کے قریں دل کا سفینہ آ گیا

بے خودی کی چاندنی میں سرسراتا تھا جلال — چہرۂ ہر مردِ مومن پر تھا احساسِ جمال

ناشناسی کی شعاعیں منتشر ہونے لگیں — جہل کی کافر ہوائیں منتشر ہونے لگیں

زندگی کی نبض میں رقصاں ہوا خونِ بہار — جی اٹھا ہر طرفِ رنگ و بو، بزمِ برق کار

آسماں والوں میں بھی ہونے لگی کچھ قیل و قال
عرش بھی ہلنے لگا تھرّا گئی ارضِ جمال

ایک دنیا نے کہا آوازۂ یزداں شکار — ایک دنیا نے کہا فطرت کے باغی کی پکار

کوئی بولا سچ تو یہ ہے نغمۂ جبریل ہے — نغمۂ جبریل کیا ہے؟ صورِ اسرافیل ہے

در حقیقت وہ ہے اک ٹوٹے ہوئے دل کا سرود
سوز میں ڈوبے ہوئے الہام کا حسنِ صعود

کاوش

مطربِ آتش نوا[1]

اقبال کی آواز میں جبریل نغمہ بار تھا — ویرانۂ اسلام پھر صد رشکِ گلزار تھا

---

[1] سب رس اقبال نمبر

نغمہ نہ تھا اقبال کا احساس کی قندیل تھا | یا لحن تھا داؤد کا یا صور اسرافیل تھا

دیتا تھا درس بیخودی قرآن کے انداز میں | پنہاں تھے اسرار خودی علم و عمل کے ساز میں

دیتا رہا، دیتا گیا سب کو اخوت کا سبق | اسلامیوں کو دے گیا صدق و محبت کا سبق

سینے میں قلب مضطرب فطرت نے بخشا تھا اسے | تعمیر ملت کے لئے قدرت نے بھیجا تھا اسے

وہ مطرب آتش نفس، فرض اپنا پورا کر گیا
اور سرمدی نغمات سے مسلم کا دامن بھر گیا

سید عبداللہ جعفری صغیر

حیدرآباد کے فن کار اور اقبال

حیدرآباد کے فنکاروں پر اقبال کے اثرات کا جائزہ لینے اور خطۂ دکن کے فنونِ لطیفہ کا تاریخی پس منظر اور اس کی ارتقائی منازل کا حال بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں خود اقبال کے خیالات اور افکار کا بھی ہم سرسری مطالعہ کرتے چلیں، تاکہ ان کے نقطۂ نظر کی روشنی میں یہ واضح ہو سکے کہ اقبال کے پیام سے کس طرح اور کس حد تک دکن کے فنکار متاثر ہوئے۔

کلامِ اقبال کے حسن کارانہ پہلوؤں کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیام کی گمبھیرتا نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ ورنہ ڈھونڈنے والوں کو اس کی تنوع اور مختلف رواں دواں بحروں میں موسیقی، الفاظ کے فن کارانہ استعمال میں صوت و آہنگ اور صناعانہ منظر نگاری میں مُو قلم کے لئے پُرجمال اور پُرجلال رنگ کاری کا ناقابلِ تصوّر سامان ملتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ موسیقی، مصوری اور اسٹیج اور اداکاری کی ہنرمندانہ خصوصیات و ضروریات سے نہ صرف کماحقہٗ واقف تھے بلکہ ان پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے، ہمارے دعویٰ کی دلیل میں زبورِ عجم کی بیشتر غزلیں اور انقلاب اے انقلاب، از خوابِ گراں خیز، سرودِ انجم، ذوق و شوق، مسجد قرطبہ،

ساقی نامہ، ابلیس و جبریل کا مکالمہ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اور خدا کا فرمان جیسی شاہکار نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں، یہ عنوانات سرسری طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ورنہ جاوید نامہ تو تمام تر فنونِ لطیفہ کی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اقبال کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی اور اس سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان چند سطور سے بھی ہو جاتی ہے جو انہوں نے عبدالرحمان چغتائی کا تعارف کراتے ہوئے لکھی تھیں، فرماتے ہیں۔

"میں سارے فنونِ لطیفہ کو زندگی اور خودی کا تابع سمجھتا ہوں، عرصہ ہوا میں نے اس باب میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنی مثنوی "اسرار خودی" میں کیا تھا۔ اس کے تقریباً بارہ سال بعد زبورِ عجم کی آخری نظم میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کی ہے۔ میں نے اس نظم میں ایک ایسے صاحبِ فن کی معنوی تحریک کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اندر محبت جلال اور جمال کی جامعیت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری ست

دلبری با قاہری پیغمبری ست

.... جہاں تک اسلام کی تہذیبی تاریخ کا تعلق ہے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے فنِ تعمیر کے استثناء کے اسلامی فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری بلکہ کسی حد تک شاعری بھی ہنوز ظہور کے طالب ہیں، وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمحِ نظر اخلاقِ الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنا (تخلقوا باخلاق اللہ) ہے ـــ دراصل انسان کے اندر ایک غیر محدود طلب (اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ) پیدا کرتا ہے اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت

۱؎ مرقعِ اقبال ص۸

کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

مقامِ آدم خاکی نہاد، دریابند
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق

صرف یہی نہیں بلکہ "ضربِ کلیم" میں جو بقول ان کے "اعلانِ جنگ ہے عہدِ حاضر کے خلاف" جو حصہ فنونِ لطیفہ کے لئے مختص ہے، اس کی سبھی نظمیں اس نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود اس کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

دکن کے فنکار اقبال کے "ہم عناں" ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ "حفظِ خودی" کے ساتھ افکارِ اقبال کی "رفاقت" کا حق ادا کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ایلورہ اور اجنتا کی افشاں سے اپنی مانگ کو درخشاں رکھنے والی سرزمینِ دکن عہدِ عتیق میں بھی دراوڑی اور آریائی تہذیب کا مرکز رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند کی تہذیبی بساط ہمیشہ بیرونی حملوں کی وجہ سے تصادم و تلاطم کا نشانہ بنتی رہی ہے اور یہاں

کی تقریباً تمام تہذیبوں کو مختلف النوع حالات و واقعات میں رام و لچھمن کی طرح دکن کا بن باس
ملتا رہا ہے۔ رام و لچھمن کو تو چودہ سال کی بن باسی کے بعد وطن کی واپسی کا موقع میسر آگیا
لیکن ان تہذیبوں کی ہجرت پر مراجعت کے راستے مسدود ہو گئے اور انہیں دکن کا معتدل موسم
راس آگیا، ہلکی پھلکی سردیاں، نرم و نازک گرمیاں اور جھوم جھوم کر چھا جانے والے بادلوں کے
خواب گوں سایوں نے ان کی رگوں میں زندگانی کا خون دوڑا دیا، گھنے جنگل اور جیا ہری کی لکیروں
کی طرح سارے ملک میں پھیلی ہوئی ندیوں کے کنارے ان کے لئے آغوش راحت بن گئے اور
اونچے اونچے سبز پوش پہاڑوں کے دامن میں انہیں گوشۂ عافیت مل گیا۔ ورنگل کا مندر اور
ایلورہ کی آذری، اجنتا کی رنگ کاری، کرناٹکی موسیقی اور نیتو و نرتیہ اور نڈرم اداکاری[1] وغیرہ آج بھی
گذرے ہوئے کارواں کے نمایاں نقوشِ قدم اور نشانِ منزل ہیں اور چند قدیم و عظیم تہذیبوں
کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

ع دکن کی گود میں آباد اک خوابوں کی بستی ہے (وجد)

یہی حال اس تہذیب کا ہوا جو محمد بن قاسم کی آمد کے بعد سندھ، ملتان، لاہور اور پھر
دہلی میں پروان چڑھی اور جس کے خطوط میں توحید کے علمبرداروں نے رنگ بھرا تھا، سب سے
پہلے اس رخشِ جہاں گرد کی باگیں محمد تغلق نے دکن کی سمت موڑیں اور مغلوں کی آمد سے بہت
پہلے گلبرگہ، بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر تعمیر کاری کے فن کو عروج کمال تک پہنچانے کا باعث
ہوئے وہی تعمیر کاری جس کی ابتدا ایبک اور التمش نے دہلی میں کی تھی۔ مغلوں کی آمد کے بعد
دربارِ اکبری کی ایجاد کردہ ہند و ایرانی آرٹ کی شبیہ نگاری کو دکن نے اپنایا اور یہاں تک کہ

---

[1] اشاراتی اداکاری

وہ اس صدی کے آغاز تک قدیم روایات کا پابند رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ برطانوی ہند میں مغربی آرٹ کا جو رجحان پیدا ہو رہا تھا اس سے بھی وہ بے بہرہ نہیں رہا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ مغربی آرٹ کا سب سے کامیاب نقال بھی جنوبی ہند میں پیدا ہوا۔ روی ورما نے ہندو صنمیات، روایات رامائن اور مہابھارت کے قصوں کو مغربی انداز میں مصور کیا جو بہت مقبول ہوئے۔ اس کی تصویروں کے چہرے اگرچہ پونا اور گجراتی علاقوں سے حاصل کئے گئے تھے لیکن انکے جسموں کے خطوط جنوبی ہند کی سڈول عورتوں کے ہوتے تھے اور ورما کے موقلم نے ان میں اس طرح کی رنگ آمیزیاں کی تھیں کہ ان پر کشمیری سیب کا گدازاور رنگ پھوٹ پڑتا تھا۔

قدیم ہندو تہذیبی اور اسلامی تمدنی روایات و آثار کے اس سنگم پر دکن کے فن کار کا ذہن جدید تحریکات کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ اقبال کی آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اقبال جس نے دکن کے ادیبوں، شاعروں اور سیاستدانوں کے ذہنوں پر اپنے انقلاب انگیز پیام کے گہرے نقوش چھوڑے تھے اور حفظ خودی کا جذبہ ان میں بیدار کر دیا تھا، اس کے اثرات سے دکن کے فنکار کس طرح بے نیاز رہ سکتے تھے، اس آواز پر لبیک کہنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان میں چند نام بہت نمایاں ہیں، آرٹسٹوں میں خان بہادر سید احمد، عبد القیوم، فضل الرحمن، معراج علی، زین العابدین، افضل حسینی، اقبال حسین، سرور ڈنڈا، حامد، عزیز سعید، سعادت اور شاہد ——— موسیقاروں میں عبدالرؤف، عبدالکریم، روشن علی، کمال الدین، خواجہ محمود بیگ، سید احمد اور اقبال کی بعض ڈرامائی نظموں کو اسٹیج پر پیش کرنے کا سہرا اکبر وفاقانی مرزا شکور بیگ، شعیب حزیں، سکیش مرحوم اور اعجاز حسین کھٹا کے سر ہے۔

خان بہادر سید احمد مدرسہ فنون لطیفہ حیدرآباد کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے پینتیس سال اجنتا کے غاروں میں تصویروں کی نقلیں اتارنے میں صرف کر دیے تھے۔

انہی کی نگرانی میں ہفتۂ اقبال کی نمائشوں کے لئے طلباء مدرسۂ فنونِ لطیفہ نے اقبال کے بیسیوں اشعار کو تصویروں میں منتقل کیا تھا اور یہ تصویریں ہندو اسلوب، مغلیہ اسلوب اور ایرانی اسلامی اسلوب کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ان تصویروں کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں پہلی بار جاوید نامہ کے فلسفیانہ تصورات کو منتشکل کیا گیا تھا۔

عبدالقیوم مرحوم حیدرآباد کے سب سے نامور آرٹسٹ تھے۔ ان کے بیشمار شاگرد تھے۔ جن میں تراب اور فضل الرحمٰن نے بڑی شہرت پائی۔ قیوم مرحوم کی دو تصویریں نعمی اور اقبال اور مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی، بڑی خوبیوں کی حامل ہیں۔ موخرالذکر تصویر میں علاؤالدین خلجی کے سپہ سالار ظفر خاں کو تاتاری فوجوں کے نرغہ میں گھرا ہوا دکھایا گیا تھا، لڑتے لڑتے اسکے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے اور وہ تلوار کو اپنے منہ میں دابے پرجلال چہرے اور غضب ناک آنکھوں کے ساتھ مصروف مدافعت تھا، اسلامی تاریخ کے اس عجیب و غریب واقعے سے شعر اقبال

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کی تشریح قیوم مرحوم کے موقلم کا حصہ تھی۔

فضل الرحمٰن بڑے چابکدست فنکار ہیں، اقبال کی نظموں کو اسٹیج پر پیش کرنے کا تجربہ اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ اگر پردوں کی تیاری اور اسٹیج کی دیگر فنی ضروریات کے اہتمام کا کام فضل الرحمٰن کے فنکارانہ ہاتھوں سرانجام نہ پاتا۔ فضل آجکل کراچی میں مقیم ہیں اور ضرورت ہے کہ ان کے تجربات سے یہاں بھی فائدہ اٹھایا جائے۔

معراج علی حلقۂ سرسید کے ممتاز و نامور رکن چراغ علی کے پوتے ہیں اور جے جے اسکول آف آرٹس بمبئی کے تربیت یافتہ۔ اقبال کی اس مشہور تصویر کو جس میں وہ شال اوڑھے ہوئے

بیٹھے ہیں، معراج علی نے بڑے ماہرانہ انداز میں کینوس پر منتقل کیا ہے۔

افضل حسینی بھی جے جے اسکول آف آرٹسٹ بمبئی کے تربیت یافتہ ہیں اور ایک عرصہ دراز سے اقبال کے اشعار کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ "سب رس" کے اقبال نمبر میں ان کی دو تصویریں شائع کی گئی ہیں، جن کے عنوانات علی الترتیب "پیام صبح" اور "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" ہیں۔ "پیام صبح" کی بنیاد ہے اقبال کی مشہور نظم۔ اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا۔"

اقبال حسینی حیدرآباد کے ہونہار فنکار ہیں۔ انہوں نے اقبال کی شال والی تصویر کا پلاسٹر آف پیرس سے رلیف بنایا ہے۔

سعید، سعادت، سرور ڈنڈا، حامد، عزیز اور شاہین اور ان کے لاتعداد ساتھیوں کی شبانہ روز محنت نے وہ بے مثال تصویری نمائشیں ترتیب دی تھیں جن کی یاد اقبالین کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی، ان نمائشوں میں خود ان فنکاروں کا کام بھی شریک رہتا تھا۔ آرٹسٹوں کے تذکرے کے آخر میں زین یار جنگ کا ذکر ضروری ہے کیونکہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اقبال کے مقبرہ کا ڈیزائن انہوں نے بنایا تھا اور اس کی تعمیر کی نگرانی میں بھی بہت کچھ حصہ لیا تھا، اس لئے کہ اس سلسلے میں حکومت حیدرآباد نے ایک خطیر رقم بطور اعتراف عقیدت پیش کی تھی۔

علم موسیقی میں حیدرآباد کا اپنا کوئی دبستان نہیں تھا، لیکن وہاں کے گلوکاروں نے اردو غزل کی پیش کشی میں ایک خاص انداز پیدا کر لیا تھا، اور غزلوں کے انتخاب میں ان کا معیار عام پیشہ ور فن کاروں سے جدا اور اونچا ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کا محبوب شاعر اقبال تھا، ان جدت پسند گلوکاروں نے "ترانہ ملی" اور "از خواب گراں خیز" کی دھنیں اتنی پر اثر اور ولولہ انگیز بنائی تھیں کہ اکثر کالجوں، اسکولوں اور عمومی

اداروں کے سماجی اجتماعوں کا آغاز انہی نظموں سے ہوتا تھا۔

عبدالرؤف جامعۂ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ ہیں اور سوز و اثر میں ڈوبی ہوئی خداداد سریلی آواز سے بہرہ مند، ذوق موسیقی ان کا پیشہ نہیں شوق ہے۔ جن لوگوں نے کلامِ اقبال کو ان کی زبان سے سنا ہے سر دھنتے رہ گئے ہیں، خاص طور سے یہ غزل جس کا مطلع ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

عبدالکریم جو اپنے بے تکلف احباب میں چاند بھائی کے نام سے پکارے جاتے ہیں تعلیم یافتہ اور شوقین فن کار، داغ کے ایک مشہور حیدرآبادی شاگرد و اصفی کے فرزند ہیں اقبال کے شیدائی اور حافظ خصوصیت سے

ع جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی اک حرفِ محرمانہ

کو جس پر اثر انداز میں وہ پیش کرتے ہیں، انہی کا حصہ ہے۔

روشن علی، کمال الدین، سید احمد اور خواجہ محمود بیگ کو بھی کلامِ اقبال کی پیش کشی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور اس سلسلے میں ان میں سے ہر فن کار اپنا اپنا انداز رکھتا ہے،

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!

اقبال کے کلام میں سے ڈرامائی حصوں کو منتخب کر کے اسٹیج پر پیش کرنے کا خیال سب سے پہلے اکبر وفاقانی کو آیا۔ اور یہ خیال ۱۹۳۸ء کے یوم اقبال کے موقع پر حقیقت بن گیا ۲۲ اپریل کی شب میں پرنس آف برار، مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری کی موجودگی میں سینکڑوں دیکھنے والوں نے سٹی کالج کے سلمی تارے سے جھلمل کرتے ہوئے اسٹیج پر "از خوابِ گراں خیز" کے ولولہ انگیز کورس کے بعد اقبال نے "خضرِ راہ" کو دیکھ لیا، "فرشتوں کا آدم کو رخصت کرنا" اور

جنتِ ارضی پر آدم کے استقبال نے مناظر ذوقِ دید کی تشنگی کو بڑھاتے رہے۔ لمبے چوڑے گونجتی گرجتی آواز والے شنکو ہیک کا ابلیس کے پرہیبت لباس میں اور دھیمے اور پرشکوہ لہجے والے مکش مرحوم کا ہرے پانک سفید براق چمکدار ریشم سے ڈھکے ہوئے ایک اونچے مقام پر سے اپنے روشن پروں کے سائے بکھیرتے ہوئے پوچھنا کہ

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے مقامِ رنگ و بو

اور ابلیس کا جواب ع

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

پروگرام کا یہ حصہ اتنا شاندار تھا کہ اس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ جبریل و ابلیس کے مکالمہ کو بعد میں بھی کئی بار پیش کیا گیا لیکن اداکار بدل گئے۔ شنکو ہیک کی جگہ حزیں نے لے لی۔ "سرو دانجم" اور "نغمہ ساربان" کی پیش کشی بھی بہت دلچسپ تھی۔ کلامِ اقبال کو مقبولِ عام بنانے کے سلسلے میں یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔

خواتینِ حیدرآباد کا ادب اور اقبال

جامعہ عثمانیہ کی بےشمار برکات میں سے ایک کو انقلابِ حیدرآباد سے پہلے کی نسل کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اور وہ ہے طبقۂ اناث میں تعلیم کا ذوق اور اس کے حصول کی ناقابلِ تصور آسانیاں، مخلوط تعلیم کا انتظام نہ ہونے کے باوجود ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم کی تمام سہولتیں انہیں حاصل تھیں اور ذریعۂ تعلیم مادری زبان اردو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کی خواتین نے بھی اپنی آنکھ سے دنیا کے ادب کو دیکھا اور اپنے ذہن سے سوچنے کی دولت انہیں میسر آئی، فارسی اور اردو کے ذوق نے جس طرح ان کی صنفِ مخالف کو اقبال کے پیام اور کلام سے قریب کر دیا تھا، کوئی وجہ نہ تھی کہ اسی ذوق کے ہوتے ہوئے وہ اقبال کی رہنمائی میں اپنی منزل متعین نہ کرتیں اور پھر اس صورت میں کہ مذہبی تعلیم سے ان کے ذوقِ علم کی بنیاد پڑتی تھی اور مذہب کی اعلےٰ اقدار سے وابستگی ان کی زندگی کا مزاج بن گئی تھی۔ اقبال کی شاعری، اقبال کا فلسفہ اور مذہب کی اعلےٰ اقدار دو الگ چیزیں نہیں، اقبال کی ہمہ گیر شہرت کا راز بھی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اسلام کے جاودانی پیام کی جانب بھٹکی ہوئی انسانیت کو متوجہ کیا تھا۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت — ہے حضرتِ انساں کیلئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

آخری شعر میں اقبال نے کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے لیکن جن خواتین کے ادب کا یہاں ذکر مقصود ہے، ان کے مدرسے نے دین کبھی بیگانہ نہیں رہا۔ اسی لئے تہذیب فرنگی کی "مرگ امومت" سے بیگانگی اور ان کے علم کی تاثیر نے ان کو "نازن" ہونے سے بچا لیا اور بالآخر ان کا ادب اور ان کی زندگی اقبال کے ان شعروں کی مثال بن گئی۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں!

حیدر آباد کی اہل قلم خواتین کی فہرست بہت طویل ہے اور اس فہرست میں چند نام تو ایسے ہیں جن کا علمی مقام بہت بلند اور ادبی کام بڑی شہرت کا حامل ہے یہ فہرست مسز سروجنی نائیڈو کے درخشاں نام سے شروع ہوتی ہے اور مسز صغرا ہمایوں مرزا، نوشابہ خاتون، رقیہ بیگم، مہدی بیگم، معصومہ بیگم، لطیف النساء بیگم، سیدہ اختر حیدرآبادی، بشیر النساء بیگم بشیر، جہاں بانو بیگم نعیم النساء بیگم، رفیعہ سلطانہ، رضیہ بیگم، رابعہ بیگم، زینت ساجدہ، وحیدہ نسیم، ثریا حمیدی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم وغیرہ کے ناموں کا احاطہ کرتے ہوئے برصغیر کی سب سے مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ پر ختم ہوتی ہے ان میں سے اکثر خواتین صاحب تصنیف ہیں، مسز سروجنی نائیڈو کی شخصیت ادبی اور سیاسی دنیا میں بین الاقوامی شہرت کی مالک ہے۔ حیدرآباد میں ان کا وجود جہاں ادب اور سیاست کی دنیا میں ایک قابلِ احترام رہنما کی حیثیت رکھتا تھا وہاں سماجی زندگی میں ان کی ذات کو "مادرِ مشفق" کا درجہ حاصل تھا۔ اقبال کے گہرے دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

یہ کاروان اپنے مقصد کے جلو میں آگے بڑھ رہا تھا کہ وہ موڑ آ گیا جہاں ایک غیر متوقع انقلاب

کی وحشت نے ساری بساط ہی الٹ دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے میخانہ ویراں ہو گیا

اور بھرنے بھی نہ پائے تھے ابھی پیمانہ ہم (انظر حیدر آبادی)

کراچی میں مواد کے عدم حصول کی وجہ سے ہم یہاں خواتینِ حیدر آباد کی وہی نظمیں اور انہی مضامین کے اقتباسات پیش کر سکیں گے جو یوم اقبال کے لئے یا ان کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ لطیف النساء بیگم[1] اپنے مضمون اقبال اور اس کی شاعری میں شعرِ اقبال کے مختلف ابتدائی ادوار کی تنقیحات کے بعد لکھتی ہیں

"اقبال کی شاعری اب ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے جو تقریباً ۱۹۱۰ء سے لے کر آج تک کم و بیش اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ جدید رنگ اس کو ایک خاص امتیاز بخشتا ہے جس کے بغیر اس کے حقیقی جوہر نہ کھل سکتے اور اس کے شدید جذبات کی حقیقی نمائندگی اور اس کے تاثرات کی سچی ترجمانی نہ ہو سکتی تھی۔ قومی شاعری میں وہ سب سے پہلے اس تڑپ کو ظاہر کرتا ہے جو ملت بیضا کے لئے اس کے دل میں ہے اور اس کا مقصد ملت کے مضمحل قویٰ اور نیم مردہ عروق میں ایک تازہ زندگی کی رو اور قومی اخلاق اور ادبیات میں نشاۃِ جدید کو پیدا کرنا ہے مگر وہ اس حیاتِ جدید کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے بچانا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیرِ اسلام اور اسلاف کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور ان کے محاسن اور کردار کی مثالیں دے دے کر مسلمانوں کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ اقبال کی اس دور کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس کا شاعرانہ وجدان حسن و عشق کے آئین، مضمون آفرینی اور اظہارِ بیان کی رسمی قیود سے آزاد ہے۔ بہ لحاظ شاعر کے

---

[1] لطیف النساء بیگم جامعہ عثمانیہ کی گریجویٹ ہیں۔ نثر و نظم پر یکساں قابو حاصل ہے۔ مخلوط مشاعرہ میں نظم نگاری کا پہلا انعام پا چکی ہیں۔

وہ دلِ دادگانِ خال و خط کے اس زمرہ میں محدود نہیں ہے، جو سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے عالم و مافی العالم کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا شاعرانہ وجدان اور طرزِ بیان اس لئے ایک خاص قدرت رکھتا ہے۔

اقبال کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے، جس کی پُر جوش اور طوفان خیز موجوں میں تبلیغ خیال اور پیامِ عمل ہے اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقاء اور تعلیم روحانی کے بیش بہا گوہر ہیں۔ اس کا حساس دل زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا متحمل نہیں ہوتا جو اس کے قریبی ماحول اور اس کے ملک و قوم میں موجود ہے۔ اس لئے وہ اس کو دور کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے کبھی تو وہ اسلاف کے کارنامے یاد دلاتا ہے جس کے بارے میں خود کہتا ہے۔

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

انہیں لطیف النساء بیگم نے ایک اور مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر بلاشبہ" یہ مضمون ان کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ اور اقبال پر ان کی ٹھوس اور صائب رائے کا ... ہے ضروری اور اہم اجزاء ملاحظہ کیجئے۔

"وہ خود ایک فلسفی ہے اور تاریخ فلسفہ کا مبصر بھی، ارسطو و افلاطون، سینا و فارابی سے لے کر ہیگل، نطشے، شیلر، کارل مارکس، برگسان اور آئین سٹائین کے نظریوں پر عالمانہ اور ناقدانہ عبور رکھتا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک نظم فکر کا حامل ہے اس لئے ان شعراء سے نسبت ہی نہیں رکھتا جو صرف تغزل کی زمینوں کو محدود سمجھ کر تصوف اور فلسفے کے روایتی زور میں ایک جدید عالمِ رنگ و بو پیدا کرنا چاہتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے دل و دماغ کسی مستحکم خیال و فلسفہ حیات سے خالی ہوتے ہیں، ان کی شاعری روایتی تصوف اور عارتی فلسفہ نگاری

کے جھونکوں میں جھول کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاکدانِ حیات سے ابلنا چاہتے ہیں اور شکوہِ خیال اور حوصلے کی بلندی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبال کا فلسفۂ حیات برگسانی فلسفے سے ماخوذ نہیں تو مماثل ضرور ہے۔ برگسانی فلسفہ کے لحاظ سے عالم تغیر میں کون و فساد کا مرکز خود متحرک ہے یعنی حقیقت خود متعین بھی ہے اور باعثِ تغیر بھی اور اس کا تغیر دوامی اور مسلسل ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

صغرا ہمایوں مرزا[1] نے اقبال سے اپنی اور اپنے شوہر کی ملاقات کا حال لکھا ہے ملاحظہ کیجئے۔

---

[1] بیرسٹر ہمایوں مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ صغرا ہمایوں حیدرآباد کی ان بزرگ خواتین میں سے ہیں جنہوں نے حیدرآباد کی خواتین میں علم و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ شاد عظیم آبادی کے استاد فریاد عظیم آبادی صغرا ہمایوں مرزا کے خسر تھے۔ اس طرح انہیں اپنے ذوق کی تشکیل اور تعمیر کا اچھا موقع ملا۔ ۱۹۱۰ء میں رسالہ النساء حیدرآباد سے جاری کیا تھا، اس سلسلہ میں اقبال سے ان کی خط و کتابت ہوئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں جب ہم کشمیر گئے، راستہ میں لاہور چند روز ٹھیرنا ہوا، ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال مرحوم کا مکان تھا، پھاٹک پر بورڈ لکھا ہوا تھا، بیرسٹر صاحب سر محمد اقبال سے ملنے گئے۔ اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے موٹر بھیج کر مجھے بلوایا۔ میں نے ایک نظم نور جہاں کے مزار پر چڑھانے کے لئے لکھی تھی، وہ ان کو دکھائی۔ اس میں مرحوم نے اصلاح دی۔ اس لئے وہ میرے استاد بھی ہوئے اور میرے آٹوگراف البم میں سر محمد اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک جملہ لکھا جس کا اردو ترجمہ درج کرتی ہوں۔

"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں۔ یعنی

ذات باری پر پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا"

محمد اقبال لاہور ۱ر جولائی ۱۹۲۸ء

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے دل میں موت کا ڈر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جو میرے آٹوگراف میں لکھا تھا وہی جملے ان کے آخری وقت میں زبان سے نکلے، وہ اپنی بیوی کو کہیں بھجواتے نہ تھے اور نہ کسی سے ملاتے تھے۔ دوران گفتگو میں لیڈی عبدالقادر صاحب سے ذکر آیا۔ میں نے کہا میں محمد اقبال صاحب کی بی بی کے ہاں گئی تھی، انہوں نے چائے پر مجھے بلایا تھا تو لیڈی عبدالقادر صاحب کو سخت تعجب ہوا، انہوں نے کہا ہمارے صاحب سے اور محمد اقبال سے بہت دوستی ہے مگر آج تک ہم نے بیگم محمد اقبال کو نہ دیکھا اور آپ مل آئیں!

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مہمان نواز دل رکھتے تھے اور مسافر کی قدر ان کے دل میں تھی۔

جہاں بانو بیگم اقبال کی وفات پر اپنے خاص انداز میں لکھتی ہیں۔

له سب رس اقبال نمبر ته جہاں بانو بیگم حیدرآبادی صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی ایم۔ اے اور کلیۂ اناث کی لکچرر، "بربطِ ناہید" کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

"کچھ نذر کو لائے ہیں مرے دیدۂ تر بھی"

قابل انشا پردازوں نے اقبال کی بے وقت موت پر اخباری دنیا کے لئے کافی مسالہ فراہم کر دیا ہے۔ کالم کے کالم اس کے ماتم میں سیاہ ہو چکے ہیں۔ آج گھر گھر اس کا تذکرہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس سانحے کے افسوس کا اظہار ہے، کتنے دل ایسے ہیں جن میں ان کا دکھ پنہاں ہے وہ کتنا خوش نصیب ہے، جس کے اتنے رونے والے ہیں یہ غریبوں کا مجازی بھگوان کس قدر جلد اپنے خدائے حقیقی سے جا ملا۔

فرانس کا سب سے بڑا مفکر و ادیب روسو کہتا ہے۔

"ہر ادبی کارنامہ انسان کا ذہنی شاہکار ہے"

خیال تو کیجئے، اقبال نے ایسے کتنے شاہکار چھوڑے ہیں۔ جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں، جو بجائے خود ایک گلدستۂ ادب ہے۔ "بانگ درا" زیادہ تر رنگ ہے اور "بالِ جبریل" تمام تر رس!! — احساس خودی اور سخت کوشی، یہ اقبال کے پیام کے دو اہم اجزا ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کر رہا تھا — کہ زندگی ختم ہو گئی۔ فلسفہ منہ ہی تکتا رہ گیا۔ اقبال ایک سچے آدمی کی طرح اپنے طرزِ کلام میں صاف اور بیباک ہے۔ جوش و خروش ہی اس کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں کا یہاں پلّہ بھاری ہے۔ اقبال کا نظریہ تھا کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت،

ناصبوری ہے زندگی دل کی

آہ وہ دل جو ناصبور نہیں!

اس باب کے آخر میں ہم حیدر آباد کی شاعرات کی دو نظمیں پیش کرتے ہیں جو اقبال سے متعلق کہی گئیں۔ یہ نظمیں نوشابہ خاتون اور بشیر النساء بیگم کی ہیں۔ نوشابہ خاتون جامعہ عثمانیہ کی پہلی خاتون گریجویٹ ہیں اور صاحبِ دیوان شاعرہ، غزل کبھی نہیں کہی، ان کی نظمیں زیادہ تر

عـ۱ سب رس اقبال نمبر

مسائلِ حیات، مناظرِ قدرت، اور حمد و نعت سے متعلق ہوتی ہیں۔ ایک عرصہ دراز سے علالت کی وجہ سے خاموش اور گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہی ہیں۔

بشیر النساء بیگم کی شاعری وحید کی طرح اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ حیدرآباد کے شعری سرمایہ میں ان کے مجموعۂ کلام "آبگینۂ شعر" کو ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

اشکِ خوں[1]

تیرہ و تاریک نظروں میں، نہ ہو کیونکر جہاں ... سایۂ اقبال سے محروم ہے ہندوستاں

گونج اٹھی جس کے نغموں سے فضائے بوستاں ... اٹھ گیا دنیا سے اب وہ بلبلِ شیریں بیاں

جس کے نغموں کا ترنم، جاں نوازِ زندگی

جس کا سوزِ دل پئے ملت تھا سازِ زندگی

ملہمِ اسرارِ غیبی، آہ جو خاموش ہے ... قلبِ ملت میں الٰہی حسرتوں کا جوش ہے

واقفِ رازِ حیات، دہر خود روپوش ہے ... واصلِ حق، آخرش وہ عارفِ ذی ہوش ہے

قوم کو درسِ بصیرت، جو صدا دیتا رہا

کشتیِ ملت جو اپنے ہاتھ سے کھیتا رہا

قوم مردہ کو دیا جس نے پیامِ زندگی ... جس کی ہر تصنیف ہے نقشِ دوامِ زندگی

جس کا اک اک شعر ہے روحِ کلامِ زندگی ... منضبط جس کے تخیل سے نظامِ زندگی

جس نے ملت کو سکھائے درسِ الہامِ خرد

منتشر آفاق میں کر ڈالے انوارِ خرد

---

[1] سب رس اقبال نمبر

جذبۂ فیاض سے پائی وسیع المشربی — فیض سے سیراب جس کے مشرقی و مغربی

رفعتِ افکار میں شامل تھی، تعلیم نبیؐ — رازِ جویانِ حقیقت کی بھی تشنہ لبی

آشکارا کر دیئے، ہستی کے اسرارِ نہاں

راہ گم کردہ منزل کا دیا جس نے نشاں

سدا پیدا ہیں جو اس شاعر کی نغمہ سنجیاں — موت میں بھی شان اسکی زندگی کی ہے عیاں

اسکے نقشِ پا ہمیں منزل کا دیتے ہیں نشاں — جسکے ہیں درسِ بصیرت رہنمائے کارواں

زندۂ جاوید بعد مرگ بھی اقبال ہے

تیرے نغموں میں نوائے زندگی اقبال ہے

نوشابہ خاتون

اقبال سے[1]

ملت سے تمنا تھی کہ لاہور کو جاؤں — قدموں پہ سرِ اقبال کے میں سر کو جھکاؤں

سعود کے کھل عرض کہ اے رہبرِ ملت — کہنے کی اجازت ہو تو کچھ اپنی سناؤں

تسلیم تری او ہے، یاں رنگِ جہاں اور — فطرت کو ہلاکت سے میں کس طرح بچاؤں

یہ جرأتِ دل جرم نہیں، خاورِ مشرق! — ذرہ کو بھی حسرت ہے کہ خورشید کو پاؤں

زنجیرِ توہم میں مقید ہے تمدن — اور روح کی خواہش ہے کہ شورش سے بچاؤں

فطرت کے خزانوں سے عطا کی گئی مجھ کو — یہ قوتِ پرواز کہ اٹھنے بھی نہ پاؤں

سنے کا یہاں نام ہے کمزوری فطرت — فرما کہ تڑپ دل کی میں کس طرح چھپاؤں

---

[1] آبگینۂ شعر: مجموعہ کلام تسنیما

سب کہتے ہیں انداز جنوں ہیں یہ نرالے — تو کہہ کہ کھلیں پھول، میں آنسو نہ بہاؤں

یاں سجدۂ بیتاب سے ہوتا ہے گماں اور — کیا حسنِ شفق دیکھ کے میں سر نہ جھکاؤں

تڑپاتے ہیں کہسار و بیابان کے نظارے — ساکت ہو تم اور میں دریا پہ نہ جاؤں

بن دیکھے کسی چیز کا قائل نہیں کوئی — دردِ تپشِ داغِ جگر کس کو دکھاؤں

فریاد ہے اے داغِ جگر پالنے والے — کیونکر غمِ ہستی سے میں ہستی کو بچاؤں

یہ آب و ہوا، وجہ پریشانیٔ دل ہے — فرما کہ تباہی سے یہ دل کیسے بچاؤں

میں منتظرِ ساعتِ اظہارِ تمنا — اور پیرِ فلک تاک میں، یہ راز نہ پاؤں

آئی یہ خبر! اٹھ گیا مسلم کا سہارا — اور امتِ مرحوم کا اقبال سدھارا

اک برقِ عمل سوز گری خرمنِ دل پر — اے کوہِ الم ٹوٹ کہ رونے بھی نہ پاؤں

تاریکیٔ شب چھا گئی رخصت ہوا خورشید — سایہ بھی گیا قوم کے سر سے گئی چھاؤں

یہ درد نہ ہوگا کبھی منت کشِ درماں — وہ دولتِ نایاب کہاں ڈھونڈنے جاؤں

فطرت یہ سدا جس کی پرستار رہی ہے — قسمت میں یہ تھا، شرفِ تکلّم بھی نہ پاؤں

جذباتِ تجسس رہے ناکام سراسر — قدرت کا یہ مقصد تھا کہ تسکین نہ پاؤں

اس تک نہ گئی جب یہ صدائے دلِ محزوں — اللہ نہ کرے میں کبھی لاہور کو جاؤں

رحلتِ اقبال[؎]

فلسفی شاعر و عالم کی نہیں کچھ تخصیص
موت کے جور سے ہے کون جو پامال نہیں

؎ آئینۂ شعر (مجموعہ کلام بشیر)

آہ رونا تو یہ ہے قوم کا دم ساز گیا

ہند میں شاعروں کا ورنہ کوئی کال نہیں

ہائے تو مر گئی قوم کی اقبال کے ساتھ

عزتِ قوم ہے مردہ اگر اقبال نہیں

۱۳ ہجری ۵۷

داستانِ اقبال[1]

چھائے آثار خزاں جب گلستانِ ہند پر
اور گھرے ظلمت کے بادل آسمانِ ہند پر

ثبت مُہرِ خامشی تھی جب دہانِ ہند پر
تھا نہ حرفِ مدعا اک بھی زبانِ ہند پر

زندگی اور موت کا احساس تک باقی نہ تھا

کوئی اس اجڑے ہوئے میخانے کا ساقی نہ تھا

جب تبہ ہونے کو تھے ہم مغربی سیلاب سے
آفتابِ قوم چمکا مطلعِ پنجاب سے

زندگی کی لہر دوڑی اس کی آب و تاب سے
نوجوانانِ وطن، اٹھنے لگے پھر خواب سے

دھیمی دھیمی دور سے دلکش صدا آنے لگی!

کاروانِ خفتہ میں "بانگِ درا" آنے لگی!

جادہ پیما سوئے منزل کارواں ہونے لگا
پرچمِ اقبال کو تھامے رواں ہونے لگا

ذرہ ذرہ زندگانی کا جواں ہونے لگا
آسماں پر شہرۂ ہندوستاں ہونے لگا

"شکوۂ اہلِ زمیں" افلاک پر جانے لگے

"بالِ جبریل" امیں سوئے زمیں آنے لگے

---

[1] آبگینۂ شعر (مجموعہ کلام بسمل)

خونِ دل دے کے پژمردہ چمن تازہ کیا
سازِ نو کی لے سے پھر ذوقِ کہن تازہ کیا

دہر میں افسانۂ دار و رسن تازہ کیا
کتنی بے باکی سے پھر نامِ وطن تازہ کیا

دھوم تھی پھر عیسیٰ معجز بیاں پیدا ہُوا
حق کا آئینہ، حقیقی ترجماں پیدا ہُوا

زندگی میں روح پھونکی گرمیٔ گفتار سے
دین و ملت کو بچایا دنیوی اشرار سے

نوعِ انساں کو رہائی دی بت پندار سے
توڑ ڈالے سحر باطل عشق کی تلوار سے

مطلعِ انوار تھا، سارے زمانے کے لئے
حق نے بھیجا تھا اسے باطل مٹانے کے لئے

پاک اس کی روح تھی اور اسکا دل فطرت شناس
عرش سے بھی دور جاتا اس کا شاہینِ قیاس

دُر کیا ایسے لاتی، اس کی طبعِ از ماس
جس سے بیگانہ زمیں والوں کے تھے فہم و حواس

دل نہ تھا پہلو میں رمزِ طور کا گنجینہ تھا
باخبر تھا، مہرِ وحدت سے مگر آئینہ تھا!

آنکھ سب کچھ دیکھ لیتی گو نشیمن دور تھا
صنعتِ صانع کا ہر ذرہ اسے اک طور تھا

ساغرِ ہستی مئے توحید سے معمور تھا
پی کے اک قطرہ بہک جاتا، نہ وہ منصور تھا

محرمِ اسرارِ حق تھا، زینتِ محفل بھی تھا
بھولے بھٹکے کارواں کا رہبرِ منزل بھی تھا

مشرق و مغرب پہ اس کے سوزِ دل کی دھاک تھی
اس کی فطرت بے غرض، بے لوث تھی، بیباک تھی

گردِ نیرنگِ جہاں سے طبع اس کی پاک تھی
دولتِ دنیا بھی نظروں میں خس و خاشاک تھی

شاعری اس کی کلام اللہ کی تفسیر تھی
اس کی اک اک بات، قومی دار کی تصویر تھی

آہ! اے مسلم، ترا آرامِ جاں جاتا رہا — خون رو! اے ہند تیرا پاسباں جاتا رہا

نظمِ ہستی کا وہ سچا ترجماں جاتا رہا — وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا

ملت آوارہ ہے، میرِ کارواں رخصت ہوا

جب بہاریں آ رہی تھیں، باغباں رخصت ہوا

اے عروجِ شاعری! اب تیری قسمت لٹ گئی — جس نے بخشی تھی حیاتِ نو وہ دولت لٹ گئی

فخر حاصل جس سے تھا تجھ کو وہ نعمت لٹ گئی — شعریت کی وہ ترنم ریز نعمت لٹ گئی

قلب کو مسرور کر لیتا مگر ساحر نہ تھا

تھا امینِ رازِ قدرت، آہ وہ شاعر نہ تھا

آہ اب آئے گا کس کے نام پیغامِ حجاز؟ — کون سمجھائے گا اسرارِ خودی کے سوز و ساز؟

اب "رموزِ بے خودی" کا کون ہوگا نغمہ ساز — اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز؟

رہروِ منزل پریشاں ہیں، فضا خاموش ہے!

کارواں لوٹا گیا، بانگِ درا خاموش ہے!

آج گو خاموش تیرا ہو چکا سازِ حیات — حشر تک زندہ رہے گی تیری آوازِ حیات

کر چکا جب ساری دنیا پر عیاں رازِ حیات — چاہتا تھا اور رفعت تیرا شہبازِ حیات

تھی ادھر مصروف تیری روح جب پرواز میں

ہو رہی تھیں عرش پر خوشیاں ترے اعزاز میں

کہکشاں کہتی تھی "دُرِّ آبدار آنے کو ہے — واپس اپنے پاس حق کا رازدار آنے کو ہے

تھا فرشتوں کی زباں پر تاجدار آنے کو ہے — ملتِ بیضا کا یعنی جاں نثار آنے کو ہے

پیرِ گردوں نے کہا، وہ آ رہا ہے سر بلند!

جس کے شکوے تھے سدا شانِ کریمی کو پسند

بولے سیارے، زمیں کا حال کیا ہو جائے گا؟ دھوم ہے حق کا پیامی آج واپس آئے گا!

چاند کہتا تھا کہ دیکھو کچھ نہ کچھ رنگ لائے گا؟ اس کا جانا اہلِ دنیا پر قیامت ڈھائے گا!

بولا رضواں، مسلم صادق کا استقبال ہے

بعد مدت کے کھڑا ہوں، آمدِ اقبال ہے

آہ! اے اقبال تجھ کو بے خبر سمجھے نہیں جو سمجھنا چاہیئے تھا اس قدر سمجھے نہیں

ہائے کیا بدبخت تھے جو بے بصر سمجھے نہیں زعم باطل تھا کہ سمجھے ہیں مگر سمجھے نہیں

تو زمانے سے نرالا تھا، انوکھے طور تھے

تیرے آئینے میں وہ رمزِ نہاں کچھ اور تھے

یوں تو چلتے ہی رہیں گے کاروبارِ زندگی گہ بجھیں گے، گاہ بھڑکیں گے شرارِ زندگی

آئے گا دورِ خزاں بھی، اور بہارِ زندگی گل کھلائے گا ہزاروں لالہ زارِ زندگی

اور صدہا ہوں گے پیدا، فلسفی، شاعر، ادیب!

آہ یہ ممکن نہیں اقبال ہو گا پھر نصیب!

موت کی ساعت کوئی قوت ٹلا سکتی نہیں اور تنِ مردہ میں واپس سانس آ سکتی نہیں

اپنی حد سے عمر اک لحظہ بڑھا سکتی نہیں روح کو لیکن اجل ہرگز مٹا سکتی نہیں

جس کی فرقت میں، جہاں بے چین ہے بیتاب ہے

دامنِ رحمت میں اس کی روح محوِ خواب ہے

اقبال کی آرام گاہ[1]

ملت کی بے حسی سے، تنگ آ کے سو گیا ہے
دنیا کی شورشوں سے، اُکتا کے سو گیا ہے
آہستہ چل صبا یاں، کیا تجھ کو ہو گیا ہے؟
پچھلے پہر کی کوئل، اے صبح کی مؤذن
کیوں شور کر رہی ہے، بے چین ہے تو کس بن؟
آ دیکھ اس جگہ پر، وہ تیرا ہمنوا ہے!
اے چاند! تجھ کو جس نے "شاعر کا دل" کہا تھا
"قومی نشان" کا تجھ کو منصب عطا کیا تھا
وہ میرِ کارواں اب، مرقد میں سو رہا ہے!

(۲)

ساکت ہے کیوں ہمالہ، اب کس کا منتظر ہے؟
اس رفعتِ بیاں پر اب کون معتقد ہے؟
وہ نغمہ سنج تیرا خاموش ہو گیا ہے!
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
کیا کیا سنا رہا تھا، اک خوش نہاد تجھ کو؟
فطرت کا وہ سندیسی، دنیا سے جا چکا ہے!

[1] آئینۂ شعر (مجموعۂ کلام بشیر)

اے شام کی دلہن کو مہندی لگانے والے!
اس کو ذرا جگا دے، سب کو جگانے والے!
مور اور چکور جاگے، اقبال سو رہا ہے!

(۳)

اقبال! قوم تیری بیدار ہو رہی ہے
تو سو گیا تو اب وہ، ہشیار ہو رہی ہے
اُٹھ دیکھ، جوش تیرا، ہر دل میں رونما ہے!
پھر ایک بار کہہ دے! "ہندوستاں ہمارا"
"ہندوستاں ہمارا! سارا جہاں ہمارا"
ہاں اٹھ، تری صدا کو عالم ترس رہا ہے!
لاہور کی زمیں ہے، اقبال مند کتنی
وابستگی سے تیری ہے سربلند کتنی
اب کعبۂ عقیدت، یہ شہر بن گیا ہے!
قلب و نظر کی دولت، اک آہِ صبح گاہی
فقرِ غیور سے ہے پیدا جلالِ شاہی
مردِ فقیر، شاہی مسجد میں جگا رہا ہے!

بہارِ آخریں[ے]

(ارمغانِ حجاز کو دیکھ کر)

نظر آنے لگے جلوے خداوندِ سخنداں کے ۔۔۔ سنبھل اے دیدۂ گریاں! کہ ہیں آثار طوفاں کے

سنائی دے رہی ہیں پھر وہی مانوس آوازیں ۔۔۔ کوئی سازِ غزل پر چھیڑتا ہے راگ عرفاں کے

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ کب کا جا چکا یاں سے ۔۔۔ یہ نغمے ہیں فقط اک گونج تھکے حدی خواں کے

نہ آئیگا کوئی پیغام تازہ اب نہ آئے گا ۔۔۔ بشیر اب بند کیا ہونگے یہ آنسو چشمِ گریاں کے

جگر کا خون دے دے کر جو بوٹے اس نے پالے تھے!

یہ اوراقِ پریشاں "ارمغاں" ہیں اس گلستاں کے!

ے آبگینۂ شعر، مجموعۂ کلام ضمیر

نونہالانِ حیدرآباد کا ادب اور اقبال

اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی اور اسماعیل میرٹھی کے بعد صرف اقبال ہی کی شخصیت ایسی ہے جس نے بچوں کے سادہ ذہنوں کی تشفی کے لئے انہی کی بول چال میں رنگ اور رس سے بھرپور نظمیں لکھیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ہلکی پھلکی نظموں میں بھی اس کا پیام پورے سوز و گداز کے ساتھ موجود ہے۔ انداز بیان میں اتنا خلوص اور اتنی لطافت ہے کہ بچے ان نظموں کو فوراً یاد کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ نئی نسل کے دل و دماغ اقبال کے عہد آفریں پیام کے لئے تیار ہوتے جاتے ہیں۔ ہم جس زمانے کی داستان سنا رہے ہیں، حیدرآباد میں ننھے منوں کی ایک ایسی قوم پروان چڑھ رہی تھی۔ جو دس برس بعد اپنے وطن کی جدوجہد آزادی میں دنیا پر عملاً یہ ثابت کرنے والی تھی کہ

کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور بالآخر جسے اقبال کے خواب پاکستان کی تعبیر یوں دینی تھی کہ وہ اس عظیم مملکت کی بنیاد کا آخری پتھر بن جائے۔

آج گو برباد ہیں بے زور ہیں بے زر ہیں ہم
تیری بنیادوں کا لیکن آخری پتھر ہیں ہم

(نظر حیدرآبادی)

حیدرآباد میں ان مستقبل کے معماروں نے اقبال میں کیا دیکھا، کیا پڑھا، اور اس کے بارے میں کیا لکھا۔ اس کی چند مثالیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

ریزیڈنسی مڈل اسکول کے ایک طالب علم ح انصاری نے کتنی پتہ کی باتیں لکھی ہیں۔

"اردو ادب کے سرمایہ پر جب کبھی نظر ڈالی جائے تو ہر ایک شخص اسے بری طرح محسوس کریگا کہ اردو کے شاعروں نے بچوں کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ جن لوگوں نے بچپن گزر جانے کے بعد شاعری کی تو انہوں نے انھی کی طرف نگاہ ہی نہ ڈالی اور جن رنگین مزاج طبیعتوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی تو انہوں نے نہ صرف اپنے ہم عمروں کی رہبانی اور اصلاح کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ اپنے بڑوں کی تقلید میں خود بھی بلبل و صیاد، فراق و وصال، آہ و فغاں اور عشق و وفا کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایسے گم ہو گئے کہ ادھر سے نکلنے کا نام تک نہ لیا یا اگر نکلنے کی کوشش بھی کی تو راہ نہ ملنے کی وجہ سے اور بھی بھٹک گئے۔

اقبال کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اپنے ملک اور قوم کے بچوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے، ان کی راہنمائی کی جائے اور انہیں صحیح راستہ پر لگایا جائے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال پہلا شاعر تھا جس کے دل میں یہ احساسات پیدا ہوئے اور اسی بات پر ہندوستانی بچوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال جہاں بچوں کے ایک مصلح تھے وہ ایک قومی شاعر بھی تھے ان کی یہی خواہش تھی کہ بچوں کے دماغ سے بھوت پریوں کے خیالات نکال کر قومی خیالات بھر دیے جائیں چنانچہ انہوں نے ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھا جس میں انہوں نے ہندوستان[۵]

---

۵ سب رس اقبال نمبر

کی عظمت کی کہانی سنائی ہے:

ایک جگہ ایک بچے کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!

اگر فلسفہ دانوں کو اس بات پر ناز ہے کہ اقبال ایک زبردست فلسفی تھا، اگر قانون داں کو اس بات پر ناز ہے کہ اقبال ایک قانون داں تھا، اگر شاعروں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک اعلےٰ درجہ کا شاعر تھا تو بچوں کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اقبال ان کا پہلا ترجمان، پہلا ناصح اور پہلا شاعر تھا۔

معین الدین احمد انصاری نے، جو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں "ماہنامہ سب رس" کے بچوں کے حصے کے ایڈیٹر بن گئے تھے، اور آج کل سابق سندھ کے کسی کالج میں لکچرار ہیں، اپنی کمسنی میں اقبال کے متعلق یہ باتیں لکھی تھیں۔

اقبال[1] کا اردو کلام بھی کئی مرتبہ شائع ہوا ہے۔ جس میں سے "ضرب کلیم" "بال جبریل" "بانگ درا" مشہور کتابیں ہیں۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ جن سے ہم کو بہت کچھ سبق حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً "بچے کی دعا" "پہاڑ اور گلہری" "مکڑا اور مکھی" "گائے اور بکری" "ہمدردی" "ماں کا خواب" اور "پرندے کی فریاد"۔ چونکہ زبان سلیس اور مضمون دلچسپ ہوتا ہے اس لئے بچے شوق سے پڑھتے اور یاد کر لیتے ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوتی ہے جس سے ہمارے اخلاق و عادات کی اصلاح مقصود ہے۔ اکثر

---

[1] سب رس اقبال نمبر

نظمیں ہمارے نصاب کی کتابوں میں شریک ہیں۔ قومی ترانے تقریباً ہر گھر اور ہر مدرسہ میں سکھائے جاتے ہیں۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جو مذہبی رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ فطرت نگاری میں بھی اقبال کو کمال حاصل تھا۔ اکثروں نے ان کو "ترجمانِ حقیقت" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ بہر حال ہماری زبان عاجز اور ہم قاصر ہیں کہ اقبال کے حالات، ان کی خوبیوں کے بیانات، بے مثل شاعری اور قومی اصلاح اور ہمدردی پر اپنے خیالات کا اظہار مفصل طور پر کر سکیں۔

نظم کو نثر میں منتقل کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے اور نظم بھی ایسی جو بچوں کے لئے بہت ہی سادہ زبان میں لکھی گئی ہو۔ لیکن اس ہفتخواں کو بھی دار الشفا ہائی اسکول کا ایک ذہین طالب علم محمد معین الدین کس آسانی سے طے کر گیا ہے۔ اس کی مثال ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ "اقبال کے چند منظوم مکالمے اور کہانیاں" کے عنوان سے اس نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ اقبال کی بعض مشہور بچوں سے متعلق لکھی گئی نظموں کو اس طرح نثر میں ڈرامائی مکالمہ بنا کر پیش کرتا ہے۔

"ایک مکڑا اور مکھی"

"ایک مکھی کا گذر ایک مکڑے کے گھر سے ہوا تو وہ اس کو دیکھ کر اس طرح کہنے لگا۔

مکڑا۔ تمہارا روز اس راہ سے گزر ہوتا ہے، لیکن کبھی میری کٹیا کی قسمت نہیں جاگی تم اس کو اپنے قدم سے عزت افزائی بخشیں۔ اگر تم غیروں سے ملنا پسند نہیں کرتیں تو اپنوں سے یہ کج ادائی ٹھیک نہیں۔ سامنے سیڑھی موجود ہے اگر آنا چاہو تو آ سکتی ہو۔

مکھی نے یہ سن کر کہا۔

حضرت! کسی نادان کو دھوکہ دیجئے۔ بس کبھی اس جال میں آنے کی نہیں کیونکہ جو آپ کی

پڑھا، پھر اترا نہیں۔

مکڑا:۔ (غصے سے) واہ تم نے تو مجھے فریبی بنا دیا۔ دنیا میں تم سا کون نادان ہو گا۔ مجھے تمہاری خاطر
تواضع میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ خدا جانے تم کہاں سے اڑتی ہوئی آرہی ہو۔ میرے گھر
ٹھہر جاؤ تو کیا برائی ہے۔ اس گھر میں کتنی چیزیں تم کو دکھلانی ہیں۔ یہ چھوٹی سی شے کیا بنے
تماشے نظر آرہی ہے۔ اس کے دروازوں پر باریک پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں
نے دیواروں کو آئینوں سے سجایا ہے۔ مہمانوں کے آرام کے لئے بستر خاص ہیں، ہر شخص کو
یہ سامانِ آرائش کہاں میسر آتا ہے۔

مکھی:۔ خیر! یہ سب درست ہے لیکن آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں آپ کے دولت خانہ میں
آؤں گی۔ مجھ کو خدا ان نرم بستروں سے محفوظ رکھے۔ اگر کوئی ان پر لیٹ جائے تو پھر اٹھ
نہیں سکتا۔

مکڑے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تو دل میں غور کرنے لگا کہ اس کو
کس طرح سے پھانسا جائے۔ دنیا میں خوشامد سے سو کام نکلتے ہیں۔ جس کو دیکھو خوشامد کا
بندہ ہے۔ یہ خیال کر کے کہنے لگا۔

مکڑا:۔ آپ کی صورت جس نے دیکھی، اس کو آپ کی صورت سے محبت ہو جاتی ہے۔ آنکھیں کیا ہیں
ہیرے کی چمکتی کنیاں ہیں۔ آپ کے سر کو اللہ نے کلغی سے سجایا ہے۔ آپ کا یہ حسن، یہ پوشاک
یہ خوبی یہ صفائی، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اڑتے ہوئے گانا ایک قیامت ہے!

مکڑے کی یہ چال کارگر ہو گئی، اس خوشامد سے مکھی کا دل نرم ہو گیا اور کہنے لگی۔

مکھی:۔ مجھ کو آپ سے کوئی خوف نہیں، میں انکار کرنا برا خیال کرتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کا دل
توڑنا اچھا نہیں!

یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹکڑے کے قریب آئی۔ ٹکڑے نے اچھل کر اس کو پکڑ لیا کئی

روز سے بھوکا تھا۔ آرام سے گھر بیٹھے مزے سے لے کر کھا لیا۔

سٹی کالج کے نویں جماعت کے ایک طالب علم مرزا عثمان بیگ نے اقبال کی وفات پر دوستوں

کا ایک پراثر مکالمہ لکھا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک نوعمر طالب علم کے قلم سے ایسی باتیں نکل گئیں

ملاحظہ ہوں۔

انور:۔ کیا آج مشرق کا اقبال ختم ہو گیا؟ اب مشرق کو زوال آچکا ہے۔ کیا اب مشرق دوبارہ اقبال

نہیں پا سکتا؟

سراج:۔ ہندوستان اور مشرق کی بدقسمتی ہے کہ اس کے اقبال کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی

افسوس وہ شمع گل ہو گئی جس کی ہر شعاع ہند کے ظلمات کو نور بخش رہی تھی۔ جو خودی نا آشنا

پروانے کو شمع خودی کا پروانہ بنا رہی تھی۔ اب تو ہم کو مجبوراً یہی کہنا پڑے گا۔

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے

شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

اسد:۔ نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ دنیا اقبال پر خون کے آنسو بہاتی رہے گی۔ مشرق کا یہ وہ اقبال مند

فرزند تھا جس نے نہ صرف مشرق کو بلکہ پوری دنیا میں اپنی قابلیت اور دماغی کاوشوں کے ذریعہ

اپنا لوہا منوایا تھا، دنیا اس کو ایک بہت بڑا مفکر اور نوع انسان کا پیغامبر مانتی تھی۔

سراج:۔ دوست واقعہ تو یہ ہے کہ ہم اس کے کلام کی خوبیاں بیان نہیں کر سکتے۔ بظاہر انسان تھا لیکن

اس کی صفات فرشتوں کی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ٰ سب رس اقبال نمبر

میرا تو جی یہ کہتا ہے کہ جس نے ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنیت میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہو جس کا دائرہ وطنیت جغرافیائی حدود سے باہر ہو۔ جس کو دنیا ایک بڑا فلسفی مانتی ہو، جس کی جس کی سیاست کا دنیا پر سکہ جما ہو۔ وہ کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔

لطیف النساء بیگم ایک صاحبِ طرز شاعرہ اور نثر نگار ہیں خصوصاً بچوں کیلئے نظمیں لکھنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے اقبال کی وفات پر بچوں کیلئے بچوں کی زبان میں ایک نظم لکھی ہے اس بات کو ہم اس نظم پر ختم کرتے ہیں

محسنِ قوم اقبال

بچہ: مری امی جاں مجھ سے کہئے ذرا — یہ تھا کون اقبال جو مر گیا
یہی ذکر ہر صبح ہر شام ہے — جدھر دیکھو اقبال کا نام ہے
بہت یوں تو مرتے ہیں دنیا میں لوگ — نہیں ہوتا لیکن کسی کا یہ سوگ
خبر پڑھ کے اخبار میں موت کی — لگی رونے اس روز تھیں آپ بھی
ہر اک اس کے مرنے سے بیتاب ہے — میں حیران ہوں امی یہ کیا بات ہے

ماں: مری جان تھا وہ بڑا آدمی — تڑپ قوم کی اس کے سینے میں تھی
نہ روؤں میں کس طرح اس پر بھلا — وہ محسن تھا پیارے مری قوم کا
بہت اس نے ہم پر کئے ہیں کرم — جنہیں یاد کر کر کے روتے ہیں ہم
یہ تعلیم دی ہم کو اسلام نے — ادا کر دو احسان، احسان سے
تری قوم کا میرے نورِ نظر — ہے خم مرنے والے کے احساں سے سر
ادا اس کے احساں ہوں گے کہاں — اگر یاد رکھے گا ان کو جہاں
اسی سے زمانے میں بس نام ہے — بڑی چیز انسان کا کام ہے
بڑا کام اس نے کیا قوم کا — جو چاہو کہ احساں ہو اس کا ادا
جگہ اس کی لے لو مرے لال تم — بڑے ہو کے بن جاؤ اقبال تم

لطیف النساء بیگم

جلسۂ تعزیت

کاش اپنی عمر کے ایام دے سکتا تجھے　　　اور واپس موت کے ہاتھوں سے لے سکتا تجھے　　دلیؔ اختر

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح اقبال کے انتقال کی پُرملال خبر لے کر آئی۔ جس نے سنا بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسا اپنے ہی گھر سے کوئی سدھار گیا۔ ابھی چار مہینے ہی تو گذرے تھے کہ ملک بھر نے نہایت تزک و احتشام سے "یومِ اقبال" منایا تھا اور کوئی امیر کوئی غریب کوئی شاعر، کوئی ادیب، کوئی حکیم، کوئی خطیب، کوئی عالم اور کوئی سیاست داں ایسا نہ تھا جس نے اقبال کی درازیٔ عمر کے لئے دعا نہ کی ہو۔

آرزوں سے بدل سکتی ہیں تقدیریں کہیں

موت پر کسی کا بس نہ چلا اور قوم کا اقبال، ملک کا اقبال، ادب کا اقبال دیکھتے ہی دیکھتے گہنا گیا۔ یہ حسرت ناک خبر جب میں نے والد بزرگوار مولانا علی اخترؔ کی خدمتِ گرامی میں عرض کی تو سناٹے میں آگئے۔ بہت دیر تک خلا میں گھورتے رہے اور پھر یکایک آنکھوں سے آنسو اور زبان پر مذکورہ بالا شعر جاری ہو گیا۔ یہ شعر ان کی نظم "وداعِ اقبال" میں شامل نہیں ہے لیکن میرے ذہن میں اس وقت کی کیفیت اور یہ شعر آج تک محفوظ ہے اس لئے یہاں اس کا اظہار برمحل معلوم ہوا۔

کاش اپنی عمر کے ایام دے سکتا تجھے　　　اور واپس موت کے ہاتھوں سے لے سکتا تجھے

شہر کے سارے کاروبار بند رہے۔ کالجوں اور اسکولوں میں چھٹی ہو گئی۔ دوسرے دن اضلاع حیدر آباد کے تمام اسکولوں اور سماجی انجمنوں نے تعزیتی جلسے منعقد کئے۔ خود شہر حیدر آباد میں ایک عظیم الشان تعزیتی جلسہ زمرد محل تھیٹر میں ہوا۔ اجلاس کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی حاضرین کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ صرف چار ماہ پہلے لوگ کس ذوق و شوق سے یوم اقبال کی تقریب سعید میں شرکت کے لئے ٹاؤن ہال پہنچے تھے لیکن اس وقت کی انبساط انگیز اور اس وقت کی کرب آمیز فضا میں کتنا فرق تھا۔

آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

ہاں سوچنے اور محسوس کرنے والوں کے لئے اتنا فرق ضرور واضح تھا کہ یوم اقبال کی تقریب طلوع آفتاب کے بعد صبح کی چمکدار روشنی میں منائی گئی تھی۔ اور یہ جلسۂ تعزیت سر شام شروع ہوا، ادھر آفتاب غروب ہو رہا تھا اور ادھر ہزاروں آنکھوں میں اقبال کی یاد آنسو بن کر طلوع ہو رہی تھی!

مقررین میں نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، نواب مہدی یار جنگ تھے، اور راجہ پرتاب گیر جی نے ہندوؤں کی اور کیقباد جنگ نے پارسیوں کی نمائندگی کی تھی، اس جلسہ کے لئے حسب ذیل حضرات نے پیامات بھیجے تھے۔

[1] قائد اعظم، راجہ صاحب محمود آباد، پرنس آف برار، سر اکبر حیدری، سر مرزا اسماعیل، سر سکندر حیات خاں، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر سید محمود اور سر سلطان احمد۔

راجہ پرتاب گیر جی نے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا۔

---

[1] سب رس کا اقبال نمبر

"ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی کون ایسا ہے جو اقبال کو نہیں چاہتا، اقبال ہے تو سب کچھ، اقبال نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس نہ مٹنے والے اقبال پر مرمٹا ہوں، جو نہ صرف اپنے میٹھے راگوں سے دل کو موہ رہا ہے بلکہ اپنے پرجوش ترانوں سے خدا کی مخلوق کو غفلت کی نیند سے جگا رہا تھا۔ وہ روحانیت کے نشہ میں چور تھا کہ جو اس کے نشہ کو دیکھے خود بخود مخمور ہو جائے۔ یعنی وہ رند بھی تھا، واعظ بھی اور شاعر بھی تھا اور متقی بھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا بانی رہا ہے۔"

کیقباد جنگ نے پارسیوں کی طرف سے کہا۔

"آج ہم اس ناقابلِ تلافی نقصان پر اظہارِ افسوس کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی المناک موت سے نہ صرف ملک ہند یا ملت اسلامیہ پر بلکہ پوری متمدن دنیا پر ڈھایا ہے۔ اقبال ہند کو اپنا وطن اور اہلِ ہند کو اپنا ہم قوم سمجھتے تھے۔ اقبال کے دل میں ہند اور اہل ہند کی سچی محبت جاگزیں تھی۔"

بہادر یار جنگ کی تقریر بڑی پر اثر تھی لیکن افسوس ہے کہ ان کی پوری تقریر محفوظ نہ کی گئی۔ البتہ تقریر کے ابتدائی حصہ کا صرف ایک جز "آثارِ اقبال" میں شائع کیا گیا ہے جسے آپ اسی کتاب میں کسی اور جگہ دیکھیں گے

مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی مخصوص من موہن اور گونجتی گرجتی لیکن اندرونی درد و کرب سے لبریز آواز میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق انگریزی لہجے میں بڑی رواں دواں تقریر تھی۔ افسوس ہے کہ یہ تقریر بھی کسی نے محفوظ نہ کی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر اقبال کا یہ شعر بڑے پرجوش انداز میں پڑھا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اگلے صفحات میں آپ وہ نظمیں اور مثنویاں پڑھیں گے جو اقبال کی وفات پر حیدرآباد میں کہی گئیں!

وداعِ اقبال

الوداع اے نُطق کی سحر آفرینی کے امام
الوداع اے محفلِ معنی کے میرِ اہتمام
الوداع اے بزمِ مشرق کے خداوندِ سخن
الوداع اے نکتہ سنج نازشِ اربابِ فن
الوداع اے مطربِ پاکیزہ الحاں الوداع
الوداع اے سرخوشِ صہبائے عرفاں الوداع
الوداع اے خسروِ شیریں کلامی الوداع
الوداع اے حسنِ فطرت کے پیامی الوداع

جا! کہ تیری منتظر تھی دیر سے خلدِ بریں
اٹھ! کہ یہ دنیا ابھی اسرار کی محرم نہیں

(۲)

اے کہ تیرے نور سے رخشاں ہوئی صبحِ وطن
تو نے کی ویرانۂ ہستی میں تعمیرِ چمن
سازِ مشرق میں سمو دی، نغمۂ مغرب کی نَے
تو نے پیالوں میں بھر دی نئے پیالوں میں صہبائے کہن
ہستیٔ موہوم سے پھوٹا حقیقت کا جمال
پنکھڑی پر جیسے رقصاں صبح کی پہلی کرن
تو نے ان پھولوں کو سینچا باغبانِ پختہ کار
انجم گردوں سے ٹکراتا ہے جن کا بانکپن
اب بجھا سکتی نہیں جس کو ہوائے روزگار
تو نے سینوں میں لگا دی زندگی کی وہ لگن
تو نے چھیڑا سازیوں اے مطربِ شیریں نوا
لے کے خود انگڑائیاں اٹھی عروسِ علم و فن

ملہ سب رس اقبال نمبر

اللہ اللہ تیری فطرت کی جمال آرائیاں
خار و خس کو تو نے دی تقدیرِ حسنِ یاسمن

تیری تدبیروں کا منت کش ہے آئینِ بہار
بھول سکتا ہی نہیں تیرا یہ احساں روزگار

(۲)

شاعرِ ہندی کہ تھا سرگشتۂ وہم و خیال
تو نے سمجھائے اسے فطرت کے اسرارِ جمال

آرٹ کی تعریف تھی یا گریۂ مرگ و مزار
شعر میں کہتے تھے یا افسانۂ ہجر و وصال

استعارے کی لطافت، خوبیاں تشبیہ کی
سطح بیں شاعر کی زد میں جو بھی تھیں پامال

شعر نے تیرے سکھایا حسنِ اندازِ کلام
فکر نے تیری جلائی شمعِ آئینِ کمال

جو تنِ بے میں ہمل بہت ہیں اور بھی اہلِ نگاہ
تھی مگر کچھ اور تیری جنبشِ موجِ خیال

شعر کا فطری سلیقہ، آگہی، فکرِ عمیق
سچ تو یہ ہے ایک بھی ہم میں نہیں تیری مثال

شاہدِ ہستی کو تو نے دے دیا حسنِ دوام
نطقِ انسانی کو تو نے کر دیا سحرِ حلال

تیری چوکھٹ پر ادب سے بڑھ کے رکھتے تھے قدم
قیصر و کسریٰ کی عظمت، پیرِ دانش کا جلال

مدتوں کرتی ہے گردش جستجو میں کائنات
تب کہیں ملتا ہے ایسا محرمِ رازِ حیات

(۳)

موت اور اقبال تو نے کیا کہا او سطح بیں!
موت اس کے گوشۂ داماں کو چھو سکتی نہیں

تو ابھی تک نارسی کی حد میں ہے گم کردہ راہ
ہستیٔ اقبال تھی سرمایۂ علم و یقیں

جس کی ہر موجِ نفس تھی نغمہ پردازِ حیات
شاعرِ مشرق کو جس نے کر دیا نازآفریں

جادو دانی حسن سے معمور تھا جس کا خیال
سرمدی انوار سے تابندہ تھی جس کی جبیں

جس نے مرجھائی ہوئی نبضوں میں دوڑایا لہو — خاک کے ذروں کو جس نے کردیا گردوں نشیں
خاک کو جس نے گلستاں کی لطافت بخش دی — جس نے گردوں سے بڑھادی سرحدِ اہلِ زمیں
جس نے کھولے بے خبر دنیا پہ اسرارِ حیات — جس کی باتیں دلپذیر اور جس کے نغمے دل نشیں
ہستیِ فانی کو جس نے جاودانی کردیا — موت اس کو چھین لے ہم سے، نہیں ہرگز نہیں

وہ بھی زندہ، اس کا پیغامِ عمل بھی زندہ ہے
زندگی کے نور سے اس کی جبیں تابندہ ہے

علی اختر

حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ

ہر طرف سے آرہی ہے آہ و زاری کی صدا — آسمانِ علم وفن پر غم کا بادل چھا گیا
چار سو اندھیر ہے مہر مبیں گہنا گیا — غمگسار قوم کو خود قوم کا غم کھا گیا

آگئی فصلِ خزاں، سارا چمن پامال ہے
سرزمینِ ہند، بزمِ ماتمِ اقبال ہے

اے دیارِ علم و حکمت خطۂ ہندوستاں — خاک سے اٹھے ہیں تیری کتنے ایسے نکتہداں[1]
بخش دی اقبال نے تجھ کو حیاتِ جاوداں — جانتا ہے اس کی نسبت سے تجھے سارا جہاں

آج شمعِ بزم گو آسودہ زیرِ خاک ہے!
اس کے اشکوں سے مگر خاکِ وطن نمناک ہے!

قوم کو جس نے دیئے لبریز جامِ زندگی — ہوگئے سیراب لاکھوں تشنہ کامِ زندگی

---

[1] بہار رنگ (مجموعہ کلام وحید)

جوش نے جس کے بدل ڈالا نظامِ زندگی ۔۔۔ غرق کر دی صبح کے جلووں میں شامِ زندگی

کشتیٔ دل کو سدا سیلاب پر کھیتا رہا

سست رفتاروں کو پیغامِ عمل دیتا رہا!

قوم کی کایا پلٹ دی شعر کے اعجاز سے ۔۔۔ ہو گئے گو کہ در واقف لذتِ پرواز سے

صدق کے دریا بہا ڈالے جنوں کے ساز سے ۔۔۔ خرمنِ باطل جلایا شعلۂ آواز سے

داغِ محکومی کو آبِ اشک سے دھوتا رہا

ملک و ملت کی تباہی پر سدا روتا رہا

بے سہارا ہو گئے ہیں آج دست و پائے قوم ۔۔۔ ہو گیا بے نور آخر دیدۂ بینائے قوم

ہو گئی کاہے مرقع چہرۂ زیبائے قوم ۔۔۔ پر تو امروز سے تاریک ہے فردائے قوم

شمع کے بجھتے ہی ساری رونقِ محفل گئی

حشر برپا ہے بنائے ملک و ملت ہل گئی

خوں بہا آنکھوں سے تو بھی آج اے اردو زباں ۔۔۔ اب حقیقت ہے ترے اقبال کی اک داستاں

موت کے قزاق نے لوٹی تری جنس گراں ۔۔۔ اور منزل سے ابھی ہے دور تیرا کارواں

تیرے جوہر دہر میں چمکانے والا مر گیا

حیف بد قسمت! ترا غم کھانے والا مر گیا

دور کی جس نے دلوں سے گردِ وہم کافری ۔۔۔ رہ گیا جس کی کرامت نے طلسم سامری

بے حقیقت ہو گئی الفاظ کی جادوگری ۔۔۔ بن گیا آئینۂ جذبات فنِ شاعری

موت کی وادی میں بادِ زندگی چلنے لگی

یاس کی محفل میں پھر شمعِ یقیں جلنے لگی

اب تری مظلوم حالت پر ترس کھائے گا کون؟ / تیرے دامانِ تہی میں پھول برسائے گا کون؟

حسن کو تیرے سا جاگر کر کے دکھلائے گا کون؟ / برتری تیری زمانے بھر سے منوائے گا کون؟

کوچ دنیا سے ہُوا اس مردِ جوہر دار کا

جس نے بخشا تجھ کو دلکش بانکپن تلوار کا

ہمنشیں قلبِ حزیں پر داغ کھاؤں کس لئے / دید کی حسرت کا افسانہ سناؤں کس لئے

سامنے اغیار کے آنسوں بہاؤں کس لئے / کیا دھرا ہے اب وہاں لاہور جاؤں کس لئے

قافلہ ہے بھی تو کیا، وہ زینتِ محمل نہیں

اب کسی کو دیکھنے کی آرزو دل میں نہیں

تو نے اے اقبال! پائی عاشقِ شیدا کی موت / جاں نثار و غمگسارِ ملتِ بیضا کی موت

موت ہے تیری زباں و قوم کے آقا کی موت / سوز و ساز و درد و داغ و عشقِ بے پروا کی موت

کون اب عقل و جنوں کی گتھیاں سلجھائے گا

کون سوزِ دل سے جان درروح کو گرمائے گا

فرقِ باطل کے لئے تو تیغِ بے زنہار تھا / مردِ کامل۔ صاحبِ دل واقفِ اسرار تھا

تا دمِ آخر مئے توحید سے سرشار تھا / بہرِ حق سارے جہاں سے برسرِ پیکار تھا

تھے ترے سب کام مولیٰ کی رضا کے واسطے

دوستی اور دشمنی، دونوں خدا کے واسطے

تیری آنکھوں میں بسا تھا روئے احمد کا جمال / ہیچ تھا تیری نظر میں بادشاہوں کا جلال

تیری شمشیرِ زباں تھی قاطعِ دستِ سوال / تیرا مسلک فقرِ حیدرؓ، عشقِ سلمانؓ و بلالؓ

شمعِ ایماں سے زمانے میں اجالا کر دیا

عشق کا تو نے جہاں میں بول بالا کر دیا

نعمتِ دیدار سے عاشق کا جی بھرتا نہیں — جان دینے میں وہ ہرگز پیش و پس کرتا نہیں

ڈرتے ہیں بے دین، مومن موت سے ڈرتا نہیں — زندۂ جاوید رہتا ہے، کبھی مرتا نہیں

مرتے مرتے فاش کر جاتا ہے رازِ زندگی

موت کے دامن پہ پڑھتا ہے نمازِ زندگی

موسمِ گل تیری تربت پر گل افشانی کرے — روح پر تیری زمانہ فاتحہ خوانی کرے!

بارشِ الطاف کی خالق فراوانی کرے — قبر پر تیری اجالا، شمعِ ایمانی کرے!

تا قیامت تجھ پہ ابرِ فصلِ گل روتا رہے!

تو یونہی آغوشِ رحمت میں سدا سوتا رہے!

(سکندر علی وجد)

امت کا شب چراغ[1]

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا

جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا

کس کی نظر نے اس کو نظر بند کر دیا

اس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا

امت کا شب چراغ اُجالے میں کھو گیا

(مخدوم محی الدین)

---

[1] سرخ سویرا (مجموعہ کلام مخدوم)

اقبالؒ[۱]

دلوں کی وادیوں میں پھول برساتا ہوا آیا
حجازی لے میں نغمہ ہند کا گاتا ہوا آیا

کہا لبیک اس کے شعر پر کلیوں نے ہنس ہنس کر
نسیمِ صبح کی مانند اٹھلاتا ہوا آیا

بہارِ لالہ و گل اس کی فطرت کا تھا آئینہ
وہ بوئے گل سے ہر وادی کو مہکاتا ہوا آیا

وہ شاعر جس کے نطقِ شعر کا احساں ہے اردو پر
ادب کی زلفِ ژولیدہ کو سلجھاتا ہوا آیا

جو باتیں رہ گئی تھیں فکرِ عطاؔر و سنائیؔ سے
ان ہی باتوں کی وہ تکمیل فرماتا ہوا آیا

شرابِ ساقیِ رومی سے بدمستِ خودی ہو کر
فضائے ہند پر اک کیف برساتا ہوا آیا

نظر آزاد، دل بے باک، فکر و ذہن بے پایاں
خودی کا پرچم رنگین لہراتا ہوا آیا

ہوا نازل زمینِ ہند پر "بانگِ درا" بن کر
وہ آیا اور ہر سوتے کو چونکاتا ہوا آیا

قلندر کی زباں میں اس نے دی تعلیم آزادی
مجاہد کی طرح تلوار چمکاتا ہوا آیا

کہا اس نے کہ ہے بے شک غلامی موت انساں کی
وہ سینوں میں خودی کی آگ بھڑکاتا ہوا آیا

کہا اس نے امیری بے فقیری ہو نہیں سکتی
وہ جبر و ظلم کی طاقت کو ٹھکراتا ہوا آیا

کلیمی ضرب کی تاثیر تھی اس کے تکلم میں
وہ ہر فرعون کی قوت سے ٹکراتا ہوا آیا

کہا اس نے مسلماں موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
فسانہ حضرتِ ٹیپو کا دہراتا ہوا آیا

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"
وہ ان اسرار کو شعروں میں سمجھاتا ہوا آیا

وہ شاعر، مردِ خود آگاہ، تہذیبِ فرنگی کو
حجازی تیغ کا آئینہ دکھلاتا ہوا آیا

وہ دل جو برف کے ٹکڑوں سے بھی بڑھ کر فسردہ تھے
وہ ان کو بادۂ الفت سے گرماتا ہوا آیا

---

[۱] محسوسات ماہر (مجموعہ کلام ماہر)

جبیں میں اسکے درخشاں تھا جلالِ شانِ فاروقیؓ | غلامی کی فضا میں گرچہ شرماتا ہُوا آیا
دیا پیغام اسلامی اخوت کا زمانے میں | جہاں میں زندگی کی روح دوڑاتا ہُوا آیا
وہ آتش جس کے سینے میں ہے گرمی سوزِ طارق کی | اسی سے دل کے خاکستر کو گرماتا ہُوا آیا
دیا تھا جو پیامِ زندگی نطق محمدؐ نے | اسی پیغام کو اقبال دھراتا ہُوا آیا

ماہر القادری

یادِ اقبالؒ

حریفِ نورِ سحر ہو سکی نہ ظلمتِ شب | جو غم کے ذکر سے مٹ جائے وہ خوشی کیا ہے
نگاہ شوق میں جنبش، زبانِ شوق خموش | اک انتظارِ اجل ہے یہ زندگی کیا ہے
نہ اپنا دل ہے، نہ اپنی زبان، نہ اپنی نظر | اسی کا نام خودی ہے تو بیخودی کیا ہے
اگرچہ عام نہیں ذوقِ خود فراموشی | مگر یہ کوئی نہ سمجھا، خود آگہی کیا ہے
فسونِ عقل کو لازم نہیں بنائے فساد | جنونِ عشق پہ یہ تیرہ افگنی کیا ہے
خبر نہیں یہ فلاکت زدہ دماغوں کو | کلاہ قیصری و تاج خسروی کیا ہے
ادھر ''گمان'' مصر دعوئے خدائی پر | ادھر ''یقین'' کو حیرت کہ بندگی کیا ہے
غرض کہ علم بھی عاجز ہے ان مسائل سے | دماغ چھین لیا کس نے اہل محفل سے

مگر بہ ایں ہمہ نیرنگیٔ جنون و خرد | بتا دیئے ہیں آدابِ زندگی تو نے
خودی کے نور سے ہر سمت اک چراغاں ہے | شب سیاہ کو بخشی ہے روشنی تو نے
وہاں سے اڑ نہ سکے طائرانِ بام حرم | بچھا دیا تھا جہاں دامِ آگہی تو نے

سلہ سب رس اقبال نمبر

جہاں کے تنگ نظر فلسفہ پرستوں کو
بنا دیا ادب آموزِ شاعری تو نے

جبھی سے گوش بر آواز ہیں فلک والے
کہی تھی شعر میں روداد زندگی تو نے

وہ جسم قوم کہ آسودۂ فنا بھی نہ تھا
اسی میں از سرِ نو جان ڈال دی تو نے

حیاتِ شعر کی تجدید کا ارادہ تھا
خدا سے مانگ لیا ذہن فلسفی تو نے

تری تلاش تھی روحانیوں کی بستی میں
اجل نہ دیکھ سکی تجھ کو بزم ہستی میں

شاہد صدیقی

آہ اقبال[1]

مل گیا خاک میں اب علم و عمل کا رہبر
اٹھ گیا دہر سے اسلام کا بیدار نظر

اس کی آواز میں اک درد بھرا رہتا تھا
زخم دل اس کی صداؤں سے ہرا رہتا تھا

آج قدرت کے ارادوں کا مفکر نہ رہا
جس کی مٹھی میں دل و جاں تھے وہ ساحر نہ رہا

اب نظر آئے گا ہم کو نہ جمالِ نغمہ
مٹ گیا عالمِ فانی سے کمالِ نغمہ

چشمِ انجم کے اشارے کوئی دیکھے تو سہی
حسنِ مطلق کے نظارے کوئی دیکھے تو سہی

آسماں شوخیٔ بے باک سے محروم ہوا
اور جہاں نغمۂ افلاک سے محروم ہوا

اس کے افکار میں گہرائی سماوات کی تھی
اس کی آہوں میں چمک، تلخی آفات کی تھی

شعر سے تازگیٔ قطرۂ شبنم پیدا
اس کی ٹھنڈک سے تصور میں تھا اک نم پیدا

محفلِ علم میں اب شعر کا اعجاز کہاں
نغمۂ انجمِ تاباں کا نواساز کہاں

---

[1] سب اس اقبال فر

آہ اسلام کی دولت کے لٹانے والے — آہ ظلمت میں نئی راہ دکھانے والے

آہ وہ شمع کہ جو عشق کی محفل میں نہیں — آہ وہ موج کہ جو حسن کے ساحل میں نہیں

جب عرب اور عجم پر تو عیاں ہوتا تھا — تجھ پہ اک برقِ تجلی کا گماں ہوتا تھا

میں تجھے خاک کی آغوش میں پاتا ہی نہیں — میں تجھے تنگ فضاؤں میں گنواتا ہی نہیں

تو ہے اس وسعتِ جاوید میں سرگرمِ سفر — جو شب و روز تری فکر کی تھی پیشِ نظر

انجم و خاور و مہتاب ہے منزل تیری — روحِ عالی ہے فرشتوں کے مقابل تیری

تیغِ فاروقؓ کے انوار دکھانے والے — فقرِ حیدرؓ کو دل و جاں میں بسانے والے

پیر رومیؒ تجھے دامن میں چھپا لیتے ہیں

عرش والے تجھے سینے سے لگا لیتے ہیں

(عبدالقیوم باقی)

آہ اقبالؒ[1]

ہندوستان پہ چھائیں کیوں شام کی گھٹائیں — ڈوبی ہوئی ہیں غم کے دریا میں کیوں فضائیں

پھیلی ہوئی ہے ہر سو کیوں موت کی خموشی — کیوں آج ہے حکومت ہر چیز پر خزاں کی

کیوں زندگی سراپا مغموم ہو رہی ہے — بے لطف اک کہانی معلوم ہو رہی ہے

لیلائے شب کی زلفیں کیوں منتشر ہیں اتنی — کیوں زرد پڑ گئی ہے شکل آج چاندنی کی

تر آنسوؤں سے کیوں ہیں مژگانِ چشمِ انجم — کیوں آج لب پہ ان کے رقصاں نہیں تبسم

کیوں پھیکے پھیکے شبنم آنسو بہا رہی ہے

پیغامِ موت لے کر کیوں صبح آ رہی ہے

[1] سب رس اقبال نمبر

رنگینیاں ادب کی آنسو نہ کیوں بہائیں
کیوں شاعری کی شمعیں خاموش ہو نہ جائیں

اقبال وہ سپہرِ علم و ادب کا اختر
وہ فخرِ ملک و ملت، وہ ہند کا سکندر

"بانگ درا" نے جس کی اسلام کو جگایا
"پیغام" جس نے اپنا "مشرق" کو کہہ سنایا

وہ جس کی "بالِ جبریل" اہل سخن نے دیکھی
"ضرب کلیم" جس کی سارے جہاں میں گونجی

وہ جس کی شاعری کا چرچا تھا آسماں پر
فریاد جس کی پہنچی دنیا سے لامکاں پر

وہ جس سے زندہ شانِ اسلام ہو چلی تھی
رنگین داستانِ اسلام ہو چلی تھی

مسلم کے دل میں پھونکی ایماں کی روح جس نے
دہرائے جس نے قصے اک بار پھر احد کے

وہ جس کی ضو سے روشن ایوان شاعری تھا
سرسبز جس کے دم سے بستان شاعری تھا

افسوس آج رخصت وہ ہو گیا جہاں سے
ہم دوش ہے بہار شعر و ادب خزاں سے

گریاں رہیں گی آنکھیں ملت کی مدتوں تک
سونی رہے گی بزمِ معنی بھی مدتوں تک!

علی احمد جمیلی

شاعرِ مشرق[1]

آسمانوں سے گزر جاتی تھی جس کی جستجو!
بندگی میں جس نے کی تھی اپنے رب سے گفتگو

عرشیوں کا دل ہلا دیتا تھا جس کا اضطراب
ذاتِ باری نے دیا تھا جس کے شکوہ کا جواب

جس کی آہوں کے شرارے دل کو گرماتے رہے
جس کے آنسو، کوثر و تسنیم چھلکاتے رہے

جس کی الجھن تھی مسلماں کیلئے وجہ سکوں
تھا خود آموزِ مشرق جس کا انداز جنوں

---

[1] گریہ و تبسم (مجموعہ کلام سالک)

بیخودی میں جس کی احساسِ خودی کا راز تھا
سوز کے پردے میں جس کا ہر نفس اک ساز تھا

کس لئے روتا ہے؟ اسکی موت پر اے کم نظر!
موت اک موہوم پردا ہے ثباتِ زیست پر

مردِ مومن مسکراتا ہے اجل کو دیکھ کر
قید و بندِ زندگی کے ماحصل کو دیکھ کر

ڈھونڈتا ہے بحر میں ساحل سفینے کے لئے
زندۂ جاوید مرتا بھی ہے جینے کے لئے

تن ہوا ٹھنڈا تو کیا! ہے روح گرمائی ہوئی
موت کے پردہ میں بھی ہے زندگی آئی ہوئی

چیر کر سینے کو داغِ دل دکھانے کے لئے
عرش پر دوڑے ہوئے رب کو منانے کے لئے

خلد کو اپنے ترانوں سے سجانے کے لئے
اڑ گئی بلبل قفس سے آشیانے کے لئے

محرمِ منزل تھا، رستے میں ٹھہر سکتا نہیں
کہہ رہی ہے زندگی اقبال مر سکتا نہیں

صاحبزادہ میکش

انتخابِ قطعاتِ تاریخی

(تاریخ نگاری ایک پرانا فن ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تاریخ کو تاریخی حیثیت حاصل ہو جائے۔ ذیل میں جو تاریخیں اقبال کی وفات سے متعلق پیش کی جا رہی ہیں وہ محض اس خیال سے کہ ان میں عقیدت کے جذبات موجزن ہیں۔ ورنہ ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جن کے بارے میں "بہت اچھی" کا اطلاق ہو سکے)

حزن و غمِ شاعر } محمد سکندر علی سکندر
۱۳۵۷ھ

سر اقبال خلدِ بریں کو گئے
۱۳۴۷ ف

علامہ سر اقبال بہشت آج گئے ہیں
۱۳۵۷ ھ

ابو المحامد محمد احمد اللہ احمد

عزتِ قوم ہے مردہ اگر اقبال نہیں
۱۳۵۷ ھ

بشیر النساء بیگم بشیر

محمد اقبال رضی اللہ تعالےٰ عنہ
۱۹۳۸ ء

معین الدین رہبر فاروقی

راہیِ خلد ہوئے میرے محمد اقبال
۱۳۵۷ ھ

کی قضا اقبال نے افسوس ہے
۱۳۴۷ ف

محمد اصغر صدیقی امجد

چلدیئے عرشِ معلّیٰ پہ ٹہلنے کیلئے
۱۳۴۷ ف

جمیل

گئے مر کر بہشت کو اقبال
۱۳۵۷ ھ

شیخ حسین شاغل

حصّۂ دوم

اقبال کے اثرات سیاست میں

اقبال اور سیاسیات حاضرہ

اقبال کی شخصیت اتنی جامع الکمالات ہے کہ اس کا احاطہ مختلف عنوانات کے تحت ہی کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے سیاسی حالات کی چھان بین اور اقبال کے فکر و عمل کے مطالعہ کے بعد جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں۔

اقبال ۱۸۷۳ء[1] میں پیدا ہوئے یعنی ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے سولہ سال اور غالب کی وفات کے چودہ سال بعد، ۱۸۹۷ء میں انہوں نے بی۔ اے اور ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے پاس کیا گویا نام نہاد "غدر" کے صرف بیالیس[۴۲] سال بعد اور بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے غیر منقسم ہندوستان کا یہ خلاق ذہن اور عظیم شاعر اور فلسفی یونیورسٹی کی اعلےٰ ترین سند حاصل کر چکا تھا اور مشرقی و مغربی مروجہ علوم کے ماہر کی حیثیت سے ان کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کا پروفیسر بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔

سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ملک کی پہلی سیاسی تنظیم (کانگریس) کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں ڈالی گئی۔ یہ زمانہ وہ ہے جب اقبال اسکول کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے ہوں گے اور

---

[1] ذکرِ اقبال صفحہ ۱۲ [2] ذکر اقبال صفحہ ۱۰

ان کے ذہن پر شعور کی پرچھائیاں پڑنے لگی ہوں گی، اور پھر ایسا ذہن جسے مستقبل میں اپنے ملک اور قوم کی رہنمائی کا فرض ادا کرنا تھا، عام طالب علم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی سوچتا ہوگا چنانچہ اس خیال کی تائید ان کی اسکول اور کالج کی نمایاں کامیابیوں سے ہوتی ہے۔ نوعمر اقبال جن حالات سے دوچار تھا وہ یہ ہیں۔

انگریزوں کے ایماء سے کانگریس کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے، انگریز — جو حاکم ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کی دلدہی پر مجبور ہے، اگرچہ اس دلدہی سے مسلمان بڑی حد تک محروم ہیں اور محرومی کا مداوا سرسید نے تعلیمی تحریک کی شکل میں پالیا ہے اور سرسید مخالفوں اور موافقین کے ہجوم میں مسلمانوں کے لئے منارۂ نور بنے ہوئے ہیں اور انہی کے جلو میں چلنے والے حالی کی مسدس ملت کے دل و دماغ پر ایک غیر فانی نقش ثبت کر چکی ہے، کانگریس کے زعماء کوشاں ہیں کہ سرسید کے توسط سے مسلمان بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ لیکن سرسید کی مصلحت بینی اور دوراندیشی اس کی روادار نہیں، گویا بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی مسلمان اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ تعلیمی تحریک کا عروج ہے اور اس طرح سرسید کے ہاتھوں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا چراغ روشن ہو چکا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ذہین اور طباع اقبال نے ان حالات و واقعات کا خاموش تماشائی کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا ہوگا، بلکہ انہی کوائف نے ان کے فلسفۂ شعر کی تعمیر میں بنیادی پتھر کا کام کیا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب آئندہ آسمانِ سیاست پر چمکنے والے بہت سے تارے یا تو بطنِ عدم میں ہوں گے یا درسگاہوں میں "لام، الف" لکھنے کی مشق کرتے ہوں گے، لیکن اقبال کی پبلک زندگی کا آغاز ۱۸۹۹ء[1] ہی سے ہو جاتا ہے۔ اسی زمانے میں وہ محفلوں اور مشاعروں کی رونق بننے لگتے ہیں ۱۸۹۹ء میں ہی نالۂ یتیم

---

[1] نیرنگ خیال - اقبال نمبر

کے عنوان سے ایک پُر اثر اور ملی جذبات سے بھرپور نظم، انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں سنائی اور اس کے بعد انجمن کے سالانہ جلسوں کے لئے اقبال کی نظم ایک ضروری چیز ہو گئی" ۱۹۰۰ء میں "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" اور ۱۹۰۱ء میں "ابر گوہر بار" کے عنوانات سے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھیں۔ اگرچہ یہ نظمیں "بانگِ درا" میں شامل نہیں ہیں، لیکن عنوانات ہی سے شاعر کے ملی جذبات اور سیاسی شعور کا پتہ چل جاتا ہے اور یقیناً یہ نظمیں حالی کی صدائے بازگشت نہیں ہوں گی، کیونکہ ۱۹۰۱ء میں "ہمالہ" جیسی شاہکار نظم شائع ہوئی جسے بلاشبہ جدید اردو شاعری کی پہلی علامت کہا جا سکتا ہے۔ ان واقعات کے دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اقبال جدید شاعری کے بانی اور امام ہیں تو میدانِ سیاست میں ان کی حیثیت شہسوار کی نہیں، سپہ سالار کی ہے اور ان کی شاعری، ان کے فلسفے، ان کے تدبر و حکمت، ان کے پیام و کلام اور قول و عمل میں ملی جذبات اور وطن دوستی کے احساسات کا شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ ہے خواہ مخواہ نقادوں نے ان کے ابتدائی اور بعد کے کلام میں فکری تغیرات دکھانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ وہ وطن پرست کبھی بھی نہیں تھے اور وطن دوستی میں وہ آخر تک کسی سے پیچھے نہیں رہے جب کانگریس رینگ رینگ کر چل رہی تھی اور اس کی سرگرمیاں واجبی مطالبات تک محدود تھیں تو اقبال کی زبانِ معجز بیان یہ سنا رہی تھی۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

۱؎ یہ صحیح ہے کہ تاریخی طور پر جدید شاعری کی ابتدا حالی اور آزاد سے ہوتی ہے لیکن اس کو معراجِ کمال پر اقبال ہی نے پہنچایا۔ اور موجودہ پوری اردو شاعری حالی و آزاد سے زیادہ اقبال سے متاثر ہے۔ اسی لئے موجودہ دور کو عہدِ اقبال بھی کہہ سکتے ہیں۔

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں

اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

اور پھر چشم باطن کو شیدہ کی لوحِ تربت کی یہ تحریر دکھاتے ہیں۔

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا

ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے

نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و رجا سے پاک ہے

قوتِ فرمانروا کے سامنے بے باک ہے

اسی زمانہ میں اقبال کے قلم نے "ترانۂ ہندی" لکھا جس کے ایک ایک مصرع میں کروڑوں ہندوستانیوں کے دل کی آواز پوشیدہ تھی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ہندوستان کی تاریخ بیداری "ترانۂ ہندی" کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس ترانہ کے علاوہ اسی زمانہ میں جب ہندوستان ایک طرح لبرل ازم کا شکار تھا اقبال اس لہجے میں اہل وطن مخاطب تھے

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا

مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو

کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر

زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین فطرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے

جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے!

یہ سب شعر ۱۹۰۵ء تک کے ہیں اور یہ لہجہ اس وقت کے شعرا کا تو کیا ذکر، سیاسی رہنماؤں کو بھی میسّر نہ تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ملک میں آزادی کی کسی تحریک کا وجود ہی نہ تھا۔ اور جو تحریکیں تھیں ان کا دائرۂ عمل سماجی، تعلیمی اور سیاسی "ریفارمز" تک محدود تھا اور اقبال کا یہ تصورِ آزادی شروع ہی سے "وطنیت" کا پابند نہیں تھا، انگلستان جانے سے پہلے ہی وہ اس نظریہ کے پیچ و خم سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا، مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ[1]

---

[1] مضامینِ اقبال ص ۲۶۱

اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔"

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۵ء سے پہلے تک کی نظموں میں ہم کو "ہمالہ"۔ "تصویرِ درد"۔ "نیا شوالہ" اور "ترانۂ ہندی" کے ساتھ ساتھ "بلال"، "شاعر" اور "سید کی لوحِ تربت" کی بھی زیارت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ غلطی سے لوگ اقبال کی ملی شاعری کو ان کی وطن دوستی کی نفی سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ اسلام ہی نے ان کو وہ وسعتِ نظر بخشی ہے جس کی وجہ سے وہ وطن دوست، انسانیت پسند اور آفاقی شاعر بنے ہیں اور ان کا یہ اندازِ نظر ان پر ابتداء سے انتہا تک چھایا ہوا ہے۔

اکثر نقادوں کی رائے ہے کہ اقبال میں ذہنی تبدیلی یورپ کے سفر کے بعد آئی۔ ہم کو اس سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں ان میں یہ وسعتِ خیال پہلے سے موجود تھی۔ لیکن یورپ کے سفر اور فرنگی مدبرین کے قریبی مطالعہ نے اس کو اور تقویت بخشی اور ان کے فلسفۂ خودی کی ترتیب میں آسانیاں فراہم کر دیں۔ اقبال کی ابتدائی تربیت جن بزرگوں کی آغوش میں ہوئی تھی اس کے نقوش ان کی فطرت میں اتنے گہرے تھے کہ زمانے کے سرد و گرم میں دھندلا نہیں سکتے تھے۔

وہ ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے ہیں اور ان کے ایک سال بعد مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اور ظاہر ہے اقبال روحانی اور ذہنی طور پر اس سے وابستہ تھے چنانچہ قیامِ انگلستان کے زمانے میں وہ مسلم لیگ کی لندن کی شاخ کے رکن بھی بن گئے تھے۔[1] واپسی پر ان کی شاعری اپنے دوسرے دور میں قدم رکھتی ہے۔ ملک کے سیاسی حالات ہی نہیں دنیا کے سیاسی حالات بدل چکے ہیں زمانے کی نبض پہچاننے والا اور ارتقا کی منازل طے کرنے والا اقبال عملاً سیاست میں حصہ تو نہیں لیتا، لیکن اس کے لیکچر، اس کے مضامین اور اس کا کلام ہندوستان کے رہنماؤں کی رہبری

---

[1] اقبال کا سیاسی کارنامہ

کرتا ہے! ہمارے اس بیان کی تصدیق قائد اعظم، گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، جواہر لال نہرو، حکیم اجمل خاں، بہادر یار جنگ، اور سروجنی نائیڈو وغیرہ کے بیانات اور خطوط سے ہوتی ہے۔ قائد اعظمؒ اقبال کے خطوط جناح کے نام کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"یہ مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی کہ اس کی قیادت اقلیت اور اکثریت رکھنے والے صوبوں میں یکساں طور پر تسلیم کی جانے لگی۔ اس کامیابی کے حصول میں سر محمد اقبال نے بہت ہی نمایاں حصّہ لیا تھا، اگرچہ عوام اس حقیقت سے ناواقف تھے"[1]

گاندھی جی ایک خط میں لکھتے ہیں۔[2]

"آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں۔ لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور یروادا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے، اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے"۔

ان دو عظیم سیاسی رہنماؤں کے چند جملے نمونۃً پیش کئے گئے ہیں ورنہ غیر منقسم ہندوستان کے تمام رہنما ان سے متاثر رہے ہیں اور ان کے لئے اپنے دلوں میں ناقابلِ تصور احترام کا جذبہ رکھتے تھے۔ طوالت کے خیال سے ہم مثالیں نظرانداز کرتے ہیں۔ لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ بہادر یار جنگ اور مولانا محمد علی کو اقبال سے تعلق خاطر میں خصوصیت حاصل ہے لیکن مولانا محمد علی کی ابتدائی سیاسی زندگی یعنی وطن پرستی اور نیشنل رجحانات کے

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام ص۸ [2] اقبال کا سیاسی کارنامہ ص۲۱

بارے میں اقبال کی رائے ہمیشہ واضح رہی۔

چنانچہ مولانا کے انتقال کے بعد وہ عباس علی خاں لمعہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مسٹر محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا لیکن ان کی اسلامی سادگی اور آخری سالوں میں اپنی بعض آراء کے بدل لینے میں جس امانت و دیانت کا انہوں نے ثبوت دیا بہت احترام کرتا ہوں۔"[۱]

آراء کا بدلنا ہی اقبال کی طرز فکر کا عملی اعتراف تھا۔ ایک اور جگہ اقبال لکھتے ہیں۔

"اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے۔ اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے"[۲]

ان کا یہ انداز فکر جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے۔ یورپ جانے سے قبل تھا، چنانچہ مولانا سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں، اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر

---

[۱] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۶۸ [۲] مضامین اقبال ص ۱۲۶ [۳] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۱

انگریزی و اردو موجود ہیں۔ جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں ہے کہ انہوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے۔ نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریکِ الہلال نے اسے مسلمان کیا، ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دلآزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا۔ اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں، کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں، مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ موخرالذکر شکایت براہِ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجئے۔"

ان طویل اقتباسات سے واضح ہو جائے گا کہ اقبال کب سے احیائے تحریکِ اسلامی کے بارے میں سوچتے اور لکھتے رہے ہیں۔ ان کا یہی فیضانِ نظر تھا جس نے حیدرآباد کے مسلمانوں کے سامنے ایک نئی راہ کھول دی تھی۔ اور دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے انہیں زیادہ مواقع حاصل تھے اور ان کے اسی جذبۂ خدمتِ اسلام کے ابھارنے میں اقبال کے کلام و پیام نے مسیح و خضر کا کام کیا ہے اسی کی تفصیلات آپ اگلے صفحات میں پڑھیں گے۔ آئندہ جو کچھ آپ پڑھیں گے۔ ان میں مولف کے ذاتی خیالات کا بہت کم دخل ہے۔ جو کچھ سنا یا دیکھا پیش کر دیا گیا ہے۔

اسلامیانِ دکن وطنیت سے ملیّت کی طرف

پورے ہندوستان میں جب سیاسی تحریکات کے طوفان اٹھ رہے تھے تو حیدرآباد ایک جزیرہ کی طرح اس کے شور و ہیجان سے محفوظ رہا۔ اگرچہ اکثر ان موجوں کے تھپیڑے اس کے کناروں سے ٹکراتے رہے لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی چین کی نیند سونے والوں کے دروازے نئے زمانہ کی دستک سے گونجنے لگے، ہواؤں کا رخ بدلا اور وقت کی رفتار میں آنے والے انقلابوں کی آہٹ صاف سنائی دینے لگی اور صدیوں کے ساتھیوں اور پڑوسیوں کی نظروں میں اجنبیت جھلکنے لگی۔ اب تک اہل دکن کی زندگی ایک قبیلہ کی برادری کی سی زندگی تھی اور "خاکِ وطن کا ان کو ہر ذرہ دیوتا تھا" لیکن رفتہ رفتہ حالات نے انہیں اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

لیکن جس وطن کی فکر کرنی تھی اور جس باغ کو بجلیوں سے محفوظ رکھنا تھا اسی کے

خواب غفلت سے بیدار ہوئے تو اس طرح کہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور خود بھی بربادیوں کے شوروں میں شامل ہوگئے۔

مغلیہ[1] شاہنشاہیت کی تباہی کے بعد اسلامی اقتدار دکن میں مملکتِ آصفیہ میں مرکوز ہو گیا لیکن اس سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے ارتقاء میں کوئی مدد نہ ملی بعیش و آرام کی اس ٹھنڈی چھاؤں نے مسلمانانِ دکن کے قوائے فکر و عمل کو بیکار کر کے رکھدیا۔ عوام سے روحِ جہاد اور خواص سے روحِ اجتہاد جاتی رہی، اس کا لازمی نتیجہ ہیئتِ حکومت میں اختلال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قضائے شرعی کی موقوفی، اوقاف کی بربادی، اسلامی قانونِ لاوارث کا تعطل اور مخالفینِ حکومت کی سرگرمیوں سے چشم پوشی، زوال آمادگی کی علامت تھی۔ حکومت کی انتہائی رواداری سے فائدہ اٹھا کر کہیں تعلیمی اصلاح کی آڑ میں، کہیں مذہبی تبلیغ کے پردے میں اور کہیں سماج سدھار کے نام سے عوام کے ذہنوں میں زہریلے خیالات داخل کئے گئے اور حیدرآباد کے مسلمان شروع شروع میں اس غیر متوقع صورتِ حال کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے۔ پچھلی جنگِ عظیم سے پہلے جب طرابلس کی جنگ چھڑی اور شمالی ایران میں روسی مظالم انتہا پر پہنچ گئے اور جب اقبال[2] نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہ گار بھی ہیں　　عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں

ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　　سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

---

[1] ملاحظہ ہو خطبۂ استقبالیہ جلسۂ اتحاد المسلمین محبوب نگر دکن از عبداللہ المدرس ص ۳ [2] اقبال کا سیاسی کارنامہ

اور پھر حضورِ رسالت مآب میں[1] اس کی یہ پیش کش دیکھی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو اس "لہو" کے نظارے نے غفلت کی نیند میں سرشار آنکھوں کو بھی چھلکا دیا۔ اپنے ہم مذہبوں کے دکھوں سے ان کی روحیں مچل گئیں اور انہیں مچلتی روحوں نے ۱۹۱۱ء ہی میں یعنی طرابلس کے شہیدوں پر اشکباری کے زمانے میں تنسیخ بنگالہ کے اعلان پر ہندوؤں کے شادیانے بڑی حیرت سے سن لیے تھے۔ جنگ بلقان کے آغاز کے بعد تو علانیہ ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے

ہے خوشی ان کو کہ کعبہ کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے

اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

اس صورتِ حال نے انہیں اپنے پچھلے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا اور ان "پروانوں" کو بھی "ذوقِ خود افروزی" اور اس "برقِ دیرینہ" کو بھی "فرمانِ جگر سوزی" ملا اور وہ بھی اپنے رب کے آگے اس طرح گڑگڑانے لگے۔

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے

مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

---

[1] اقبال کا سیاسی کارنامہ

جنس نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے

ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

مدتوں کی "دیر نشینی" نے ان پر ثابت کر دیا تھا

اس دور میں مئے اور ہے جام اور ہے جم اور | ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور | تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

"یہ بت" ان کے لئے "تراشیدۂ تہذیب نوی" نہیں تھا۔ وہ تو انیسویں صدی کے جاگیر دارانہ ماحول میں سادگی اور امن کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ "یہ غارت گر کاشانۂ دین نبوی" یورپ کے جادوگروں کا پھیلایا ہوا ایک ایسا طلسم ہے جس کے بطن سے "اقوامِ جہاں" کی رقابت "اور مقصودِ تجارت سے تسخیر" جنم لیتی ہے اور سیاست کو صداقت سے خالی اور کمزور کے گھر کو غارت کر دیتا ہے۔ اور

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کی بصیرت نے ان کی آنکھیں کھولدیں اور انکے دلوں کی گہرائیوں میں یہ بات نقش ہو کر رہ گئی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اب وطن ان کیلئے منزل نہیں رہا۔ چراغِ رہگذر بن گیا جس کی روشنی میں انہیں اپنی خلافت، سلطنت و حکومت کی حفاظت اور اس کی توسیع و استحکام کے اہم کام کو سرانجام دینا تھا۔ اس سفر کا آغاز تو ہو گیا۔ لیکن انجام، انجام انہوں نے خدا کے سپرد کر دیا تھا!

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

مسلمانانِ دکن کی قیادت اور اقبال

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اسکی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

اتحاد المسلمین کی تنظیم جدید اور اس کی جدوجہد اور اس کے آغاز و انجام کی ساری تاریخ اقبال کے ان دو مصرعوں میں محفوظ ہے۔ مسلمانانِ دکن کی سیاسی جدوجہد کا آغاز بہادر یار جنگ کی قیادت میں ہوا اور اختتام قاسم رضوی کی رہنمائی میں!——

بہادر یار جنگ نے ایثار و عمل کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جن کی مثال صرف اسلاف کی تاریخ کے صفحات میں مل سکتی ہے۔ خدا کی راہ میں اسماعیلؑ ایک عظیم انسان کی طرف سے پہلی قربانی کے طور پر پیش کئے گئے جسے مشیت ایزدی نے کسی اور انداز میں قبول کیا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بہادر یار جنگ نے دکن کے مسلمانوں کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا، دوسروں کی زندگی کے لئے خود فنا ہو گئے!

قاسم رضوی کے سامنے اپنے ایک روحانی رہنما کی سنت کے علاوہ اس کا ایک دنیوی قائد بھی تھا جس نے انہیں آخری بار ٹیلیفون کے ذریعہ کراچی سے پیام دیا تھا۔

"خدا پر بھروسہ رکھو، کبھی ہتھیار نہ ڈالنا، امام حسینؑ کو پیش نظر رکھو، مجھ سے جو ہو

سکے گا وہ میں کروں گا۔"

مسلمانانِ دکن کے پہلے قائد بہادر یار جنگ کی شخصیت کا خمیر ہی اقبال کی فکر سے اٹھا تھا
ایک بڑے امیر ہونے کے باوجود "افرنگی صوفوں" اور "ایرانی قالینوں" سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی
وہ بہت بڑے زمیندار تھے لیکن "الارض للہ" پر ایمان رکھتے تھے، اور وقت آنے پر انہوں نے
اپنی جاگیر، خطاب اور منصب نظامِ دکن کو لوٹا بھی دیئے تھے اقبال کے ان اشعار کے معنی و مطالب
ہم پران کے دیدار سے نمایاں ہوئے تھے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز!
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات۔
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز!
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز!
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز!

مسلمانانِ دکن کی تنظیم انہوں نے جن خطوط پر کی تھی اس کے پیچھے فکرِ اقبال کی کارفرمائیاں
ہمیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔[1]
"اقبال کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے پورے

---

[1] سیاسی تقاریر بہادر یار جنگ صفحہ ۱۵

کلام میں انہوں نے اسی چیز کو بہ اندازِ مختلف پیش کیا ہے اس کے لئے انہوں نے

جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے

وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرواز و فضا پیما ہے۔ اقبال کے

کلام کا رنگ شاہبازی سکھاتا ہے انہوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبتِ مرغِ چمن نہیں بلکہ

وسعتِ ارض و سما ہے"

اس سلسلہ میں انہوں نے فطرتِ انسانی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت و مشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا

عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں۔ جن پر اس کی

باعزت انفرادی و اجتماعی زندگی کا مدار ہے۔ ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری

اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبۂ عزتِ نفس ہے اور مفت خوری کا اثر

سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت و بلند ہمتی چین اور پستیٔ خیال

سے بدل جاتی ہے۔ اسی کو اقبال نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابندِ قفس کر کے عطائے صیاد کا امیدوار بنا دو تو چند

روز میں وہ تیتر کے پر کی پھڑپھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

تنش از سایۂ بالِ تذروے لرزہ می گیرد

چو شاہین زادہ اندر قفس با دانہ می سازد

تم غور کرو کہ کیا حیدرآباد کا مسلمان گذشتہ دو سو سال سے "اندر قفس با دانہ ساختن"

کا عادی نہیں ہو گیا ہے اور کیا اسی کا نتیجہ آج اس شاہین زادہ کی روح سایۂ بالِ

تذروے سے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا کام ہے اور قید و صید کی بندشیں قسمتِ شاہیں کی سعادت، اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گزرتا، عزت و احترام کے مقامِ رفیع کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کین سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

انہوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمتی چھوڑیں اور شاہیں کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

اقبال کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و سپر سے بھی آراستہ نہ ہو۔ ان کے نزدیک شاہیں زادگی کی شرطِ اول مردِ غازی کی تیغ و سپر سے موانست ہے فرماتے ہیں۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را!"

انہوں نے مسلمانانِ دکن کو جو دو سو سال سے "اندر قفس با دانہ ساختن" کا مصداق بنے ہوئے تھے۔ اپنی آتش نوائی سے جھنجھوڑ دیا۔ فضا پیمائی کا سبق دیا اور انہیں قسمتِ شہباز و شاہیں کی سعادت سے آشنا کر دیا۔ حیدر آباد کے مسائل دیگر اقطاعِ ہند کے مسائل کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت کے تھے، وہ دستورِ جدید کے تحت بننے والے وفاق میں شرکت پر آمادہ نہیں تھے۔ حکیم مشرق کی اس رائے کی ان کے اپنے مسائل کی وجہ سے بڑی اہمیت ہو گئی تھی۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

انساں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!

بہادر یار جنگ کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس گنتی میں مسلمانوں کا رہا سہا اقتدار تنکے کی طرح اڑ جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تائید میں جمال الدین افغانی کا وہ طرزِ عمل پیش کیا، جو ملوکیت دشمن افغانی نے حیدرآباد کی زندگی میں اختیار کیا تھا۔ اسی طرزِ عمل کی روشنی میں انہوں نے اسلام کی بیخ کنی۔ اور غلامی کے اندیشہ اور وسوسہ کو مسلمانوں میں بیدار کر کے انہیں خوابِ غفلت سے جگایا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں بہادر یار جنگ نے مسلمانانِ دکن کو "اپنی خودی" کو پہچاننے کا شعور عطا کیا۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی

نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب

خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد

نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر!

اپنے "محیط" میں آزاد رہنے کی جو جوت انہوں نے جلائی تھی۔ اس کی روشنی میں دکن کے مسلمانوں نے سیاسی جدوجہد کی راہ متعین کی۔ ان کا ذوقِ یقین ایک مردِ مومن کی نگاہ کا فیضان تھا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس مردِ مومن نے مسلمانانِ دکن کے لئے جس منزل کی نشاندہی اور جو راہِ عمل متعین کر دی تھی وہ منزل تھی دکن کی مکمل آزادی کی منزل، اور وہ راہِ عمل تھی مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ کی حفاظت! اس سلسلے میں کسی سمجھوتے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ان کے جانشینوں کو بے سروسامانی کے باوجود اسی متعین اور سیدھی راہ پر گامزن ہونا تھا کس میں اتنی مجال تھی کہ اس سے سرِ مو انحراف کرتا۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام

ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز!

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی

ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز!

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار

کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز!

اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت

دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز!

اس "مردِ خود آگاہ و خدامست" کی صحبت کے فیض یافتہ اس کی غیر متوقع شہادت کے بعد مسلمانوں کے دل شکستہ کاروان کو آگے بڑھاتے رہے تا آنکہ وہ وقت آگیا جب جنتری میں

۱۹۴۷ء لکھا جاتا اور مہذب دنیا میں تقسیم ملک کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن انسانیت کی تاریخ میں جسے وحشت و بربریت کے دور سے یاد کیا جائے گا، ایسے پرآشوب اور نازک زمانے سے صرف چھ ماہ قبل بہادر یار جنگ کا منصبِ قیادت قاسم رضوی[1] کو سونپا گیا۔ اور جب اس ڈرامہ کا ڈراپ سین گرا اور ہندوستانی فوجوں نے قاسم رضوی کو گرفتار کر لیا تو ان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے مطالعہ کے لئے کیا ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

قرآن مجید، سیرت النبی اور کلامِ اقبال کی جلدیں!

---

[1] بہادر یار جنگ کی رحلت کے بعد اسلامیانِ دکن کی قیادت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت قاسم رضوی کو حاصل ہے۔ وہ بڑے نڈر اور دولتِ دنیا سے بے نیاز انسان ہیں چنانچہ بہادر یار جنگ کی چندے کی اپیل کے زمانے میں انہوں نے اپنی پوری جائداد مجلس اتحاد المسلمین کی نذر کر دی تھی اور قوم سے "صدیقِ دکن" کا خطاب پایا تھا۔ آج کل کراچی میں اپنی سیاسی زندگی پر کتاب لکھ رہے ہیں۔

اقبال کا تصوّرِ پاکستان اور حیدر آباد

بے اختیاریوں کا بہانہ بدل گیا
وہ لَے بدل گئی وہ ترانہ بدل گیا
تازہ حقیقتوں سے فسانہ بدل گیا
فکر و عمل کے ساتھ زمانہ بدل گیا
موجِ نشاط آئی، کلی دل کی کھِل گئی
تعبیرِ خوابِ حضرتِ اقبال مل گئی
(نظر حیدر آبادی)

یہ ۱۹۴۲ء کی ایک نظم کا پہلا بند ہے۔ اور اس زمانے میں اہلِ حیدر آباد کے پاکستان کے متعلق یہی عام احساسات تھے، گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑے ہو کر جب اقبال نے پاکستان کا خیال پیش کیا تو اسے شاعر کے خواب سے تعبیر کیا گیا لیکن صرف دس برس بعد اقبال کی ابدی آرامگاہ لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں قراردادِ پاکستان پیش کی گئی اور یہی قرارداد مسلمانوں کا نصب العین قرار پائی، لیکن جن حالات میں یہ قرارداد پیش کی گئی اور مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا، وہ ناقابلِ فراموش ہیں اور اس جلسہ کے انعقاد اور کامیابی میں بھی حیدر آباد کے ایک فرزندِ جلیل کی فراست اور خطابت کا بڑا دخل ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے "یارانِ کہن" میں سر سکندر حیات خاں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا سر سکندر کے حلم و تدبر کے سر ہے۔ مولانا

کی بہ رائے ایک حد تک درست کہی جاسکتی ہے لیکن لاتعداد شاہدین اور واقفِ حال اب بھی زندہ ہیں جو مسلم لیگ کی اسپیشل ٹرین میں دہلی سے لاہور آئے اور اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے وہ ہمارے اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ جب لاہور میں خاکساروں پر سر سکندر کی حکومت نے گولی چلائی ہے تو فضا اس درجہ مکدر ہو گئی تھی کہ خود سر سکندر نے ٹیلیفون پر قائداعظم سے درخواست کی تھی کہ جلسہ کو ملتوی کر دیا جائے۔ مسلم لیگ کے بعض اونچے مدبرین بھی اس رائے سے متفق ہو گئے تھے اور قائداعظم کو بھی متزلزل کر دیا تھا لیکن صرف بہادر یار جنگ کی تنہا ذات تھی جو اجلاس کے التوا کی مخالف تھی۔ انہوں نے قائداعظم کو اپنی ذاتی عقیدت و اثر کی وجہ سے اجلاس کو ملتوی نہ کرنے پر راضی کر لیا اور مسلم لیگیوں کی اسپیشل ٹرین لاہور کی جانب روانہ ہوئی۔ پاکستان کا پہلا کاروان اور ہراول دستہ جو اپنے رہنما، سپہ سالار اور ہمسفروں، سپاہیوں اور حدی خوان پر مشتمل تھا، اقبال کی ابدی آرام گاہ لاہور کی طرف چل پڑا، ایک شاعر اعظم کے خواب کو قوم کا نصب العین بنانے کے لئے!

اس کارواں کے حُدی خوان بہادر یار جنگ تھے، انہوں نے لاہور پہنچتے ہی خاکساروں کے ایک ایک کیمپ کا دورہ کیا اور اپنی عدیم المثال خطابت سے نوجوانوں کے سلگتے ہوئے جذبات کو سرد کر دیا۔ تکدر اور بے یقینی کی فضا ختم ہو گئی اور پہلے اجلاس عام کی پہلی تقریر بھی بہادر یار جنگ کی تھی۔ اس تقریر نے جادو کا اثر کیا، پنڈال قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا جس کہ چند گھنٹے پہلے تک سر سکندر کے نام سے بھڑکنے والے سکندر زندہ باد کا نعرہ لگانے لگے اور غلط فہمیوں کا پیدا کردہ ماحول خوشگوار عقیدت سے بدل گیا۔

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر

مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ!

یہی وجہ تھی کہ قدیم طلبائے جامعہ عثمانیہ کے جلسہ میں (منعقدہ کراچی ۱۹۵۶ء) تقریر کرتے ہوئے سابق وزیرِ نشریات واطلاعات وحال سفیرِ پاکستان متعینہ فلپائن پیر علی محمد راشدی نے کہا تھا

"تحریکِ[1] پاکستان میں حیدر آباد نے بے شمار زر ودولت کے علاوہ بہادر یار جنگ کو بھی دیا تھا، جن کی خطابت نے اس تحریک کو دس کروڑ مسلمانوں کا مقصدِ حیات بنا دیا تھا"

دراصل ان کی آواز میں شعرِ اقبال کی حلاوت اور قائدِ اعظم کے تدبر کی شوکت مضمر ہوتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں جواں مرگ بہادر یار جنگ کو قائدِ اعظم کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا۔ قائدِ اعظم کو ان پر بڑا اعتماد تھا، پاکستان کی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے جو وفد قائدِ اعظم نے شمالی ہند اور صوبہ سرحد کے دورے پر روانہ کیا تھا اس کی قیادت کا منصب بھی بہادر یار جنگ کو سونپا تھا۔

تحریکِ پاکستان کے فروغ کے سلسلے میں اہلِ حیدر آباد کا "چندہ" ایک عظیم انسان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ قیامِ پاکستان کو حیدر آباد کی آزادی کے تحفظ کے لئے بھی ضروری سمجھتے تھے۔ حیدر آباد کے قائدین تاریخ کے بہت ہی نازک دور میں کچھ اس طرح سوچا کرتے تھے۔

"ایک[2] دوسرا اہم مسئلہ جو ہمارے دل و دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر رہا ہے اور جس کے سلسلے میں غرض مند طبقات عجیب وغریب غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، مسلم قوم کا مطالبہ آزاد

---

[1] دیکھئے ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء کا ڈان۔ [2] خطبہ استقبالیہ صوبہ کانفرنس منعقدہ محبوب نگر (دکن) از عبداللہ المسدوسی۔ عبداللہ المسدوسی کا شمار حیدر آباد کے مخلص رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ آج کل کراچی میں ہیں۔ اور اردو کالج میں قانون پڑھاتے ہیں۔ آپ کی تازہ تصنیف "مذاہبِ عالم کا سیاسی جائزہ" کو علمی حلقوں میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

ہندوستان یا پاکستان ہے۔ قومی وطن کے اس مطالبہ کی موافقت یا مخالفت میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ البتہ اس مطالبہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے اس کے مختلف پہلو اور مختلف جماعتوں کے خیالات پیش ہیں تاکہ حیدرآباد کے تعلق سے اس مطالبہ کے اثرات سمجھ میں آجائیں۔

عام طور پر سطح بیں حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مطالبہ دراصل کانگریس راج کے مظالم کے خلاف مسلمانوں کی ناراضی کا مظاہرہ ہے لیکن اس کی بنیاد اس سے زیادہ گہری ہے، تاریخی حقائق، بین الاقوامی تعلقات اور براعظم ہند کے مخصوص حالات نے اس کو پیدا کیا ہے۔ ہندوستان اپنی وسعت، آب و ہوا، ذرائع، باشندوں کے طبائع، مذہب اور تمدن، السنہ اور نسلوں کی وجہ سے حقیقی معنی میں براعظم ہے۔ پراچین تہذیب اور آریائی دور میں بھی یہ کبھی دائمی طور پر ایک مرکزی حکومت کے تابع نہیں رہا، تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلامی عہد اور دورِ مغلیہ میں یہ ایک مضبوط وحدانی حکومت کی برکات سے متمتع ہوا۔ لیکن اس دور میں بھی بعض خطے علیحدگی کے لئے کشمکش کرتے رہے اس طرح اس عہدِ زریں میں بھی ہندوستانِ عظمیٰ کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ مغلیہ شاہنشاہت کے زوال کے بعد برطانوی عملداری میں ہم ہندوستان کے تقریباً دو تہائی حصّے کو بدیسی قوم کے زیرِ نگیں دیکھتے ہیں لیکن بقیہ ایک تہائی دیسی ہندوستان کا مُلا جُدا گانہ نظامِ حکومت سے پیدا شدہ مختلف ماحول اور آئین کا پابند نظر آتا ہے۔ دو تہائی برطانوی علاقہ میں بھی کامل مشابہت و مماثلت کا رنگ صرف ایک ہی مرکزی ہیئتِ حاکمہ کا نتیجہ تھا، ورنہ امتیازی اور اختلافی عنصر ناپید تھا۔ کہیں رعیت داری سسٹم تھا تو کہیں زمینداری، وقس علیٰ ہذا۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ متحدہ ہندوستان کی اصطلاح حقیقی معنی کے اظہار سے زیادہ متحدہ برطانوی حکومیت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بعض عارضی اور اتفاقی واقعات کے زیرِ اثر یہ خیال پھیلتا چلا گیا کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور اس براعظم کی

رہنے والی مختلف اقوام دراصل ایک ہی قوم ہے۔ بعض لوگ، یہ بدگمانی کرتے تھے کہ برطانوی استعمار نے اپنے تسلط کو دائمی بنانے کے لئے ہندوستانی قومیت کے اس غلط تصور کی پرورش کی۔ لیکن اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی شعور اور تعلیم عامہ کی کمی کے باعث ہندوستانی اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ وہ ایک قوم ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے اثرات کے تحت اور بین الاقوامی تحریکوں کے مدنظر مشرق میں جو بیداری پیدا ہو رہی تھی اس سے ہندوستان بھی متاثر ہوا اور رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا کہ ۳۵ کروڑ انسان یعنی دنیا کی ۱/۵ آبادی قومیت کے قدیم و جدید کسی معنی میں بھی ایک قوم نہیں کہلائی جا سکتی اور اگر ایک قوم کے غیر فطری تصور کو اپنے اوپر عائد بھی کر لے۔ تو پنپ نہیں سکتی۔ چین کی مثال اس کا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی عقلمند آدمی مغربی ممالک کی آبادی کو ایک قوم نہیں سمجھتا جو روس کو علیحدہ کر دینے کے بعد تعداد میں اتنی ہی ہے جتنی ہندوستان کی ہے لیکن مدرسہ کا بچہ بھی جانتا ہے کہ وہاں جرمن، فرنچ، برٹش، اٹالین، ہنگری، پولش، ہینش، چیکس، ولندیزی وغیرہ بیسوں قومیں ہیں، جو اپنی انفرادیت اور قومیت کی بقا کے لئے ربع صدی کے اندر دنیا کو دو مرتبہ مصیبت عظمیٰ اور قیامت صغریٰ میں مبتلا کر چکی ہیں حالانکہ مذہب (عیسائیت) مشترک ہے۔ کلچر بڑی حد تک ایک ہے۔ تعلیم عام اور سیاسی بیداری مسلّم ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے برِّ اعظم کے متعلق یہ تصور کس قدر غیر فطری اور مضحکہ خیز ہے جب کہ مذاہب جداگانہ ہی نہیں بلکہ اپنے بنیادی اصولوں کے تحت متضاد ہیں ایک جس سے پاک ہوتا ہے دوسرا اس سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ دونوں جداگانہ تہذیبیں متوازی راستوں پر چلتی پھولتی ہیں اور پھر اس کے ساتھ ماشاء اللہ جہالت کی بھی کوئی کمی نہیں۔ سیاسی شعور اور بیداری اونچے طبقات کا اجارہ بن گئی ہے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر برہمن اور دیگر اقوام برش وحواس۔ کے عالم میں تقسیم ملک کی تائید کرتی ہیں۔ اس تحریک کے مخالفین

اس کے بالکل برخلاف اس کو سامراج کی حمایت اور تعریفی حکمتِ عملی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو فرزندانِ اسلام کی رجعت قہقری کہتے ہیں اور قرآنی احکام اور اسلامی تعلیمات کی رُو سے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ مسلمان مفتوحہ ممالک اور اپنی چھاؤنیوں سے ترکِ وطن کریں۔ وہ ترکِ وطن کے سوال کو ہجرت بھی نہیں سمجھتے۔ مہاسبھا اس کو اسلامی ممالک کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی وہ سازش قرار دیتی ہے جس کا منشا مشرقِ قریبہ و وسطیٰ کے ممالک کے اتحاد و امداد سے اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ بعض لوگ اس کو اقبال کی غیر عملی اور فلسفیانہ بات سمجھتے ہیں۔ جس کو ایک قوم کے سیاسی بحران نے مطالبہ کی شکل دے دی ہے۔ اس لئے زیادہ معتدل حالات اور موجودہ سیاسی ہیجان کے ختم ہونے کے بعد ان کے نزدیک یہ فلسفیانہ موشگافی دھری رہ جائے گی۔ ہندوستانی سیاست میں پہلی بار ایک انقلابی تخیل پوری قوت سے سامنے آیا۔ اسی لئے یہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہے۔ مستقبل ہی اس کا تصفیہ کرے گا کہ یہ تخیل کتنا حقیقی اور جاندار ہے سوال یہ ہے کہ اس چوکھٹے میں حیدرآباد کہاں چسپاں ہوتا ہے۔ اقبال کے ابتدائی تخیل اور بعد کی متعدد اسکیموں پر غور کرنے کا یہ وقت نہیں۔ البتہ یہ حقیقت واضح اور ناقابلِ تردید ہے کہ حیدرآباد کے متعلق ہمارے ادعا سے یہ مطالبہ کہیں متصادم نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمارے دعویٰ کو مضبوط کرتا ہے۔ حیدرآباد ایک آزاد مملکت ہے اور مسلمانوں کا قومی وطن! اور جنوب میں مسلمانوں کے اس قومی وطن کو قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کا ایک قوی بازو بننا تھا۔ حیدرآباد کے اہلِ نظر نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا کہ تقسیمِ ملک کا لازمی نتیجہ ترکِ وطن ہوگا، اس لئے بھی حیدرآباد کا وجود جنوبی ہند اور وسطِ ہند کے مسلمانوں کے لئے ضروری تھا۔ اور یہی وہ روزِ روشن کی طرح نمایاں حقیقت تھی جس نے بہادر یار جنگ کی زبان سے ان کی شہادت سے قبل یہ جملے نکلوائے تھے

"یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہِ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں، میں عبدالملک

نہیں، عبداللہ ہوں، اور دنیا کا کوئی صاحبِ ایمان عبداللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں تخت و تاجِ آصفی پر اس لئے قربان نہ ہوں گا کہ وہ جلالت الملک میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے۔ کسی فردِ واحد کے لئے میری قربانی نہ شہادت ہے نہ ایثار اور نہ خدا کے پاس اس کی کوئی جزاء۔ میں اپنی قربانی۔ اور اس کی جزا کو زائل نہیں کرنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تخت و تاجِ آصفی اور اقتدارِ شاہانِ آصفیہ پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملتِ اسلامیہ کا اقتدار، اس تخت و تاجِ آصفی کو ملتِ اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں۔ اور اقتدارِ ملتِ اسلامیہ اعلائے کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں ہو سکتا، لہٰذا میں حفاظتِ تخت و تاجِ آصفی اور تحفظِ اقتدارِ شاہی کو تحفظِ ملتِ اسلامیہ و اعلائے کلمۃ الحق سمجھتا ہوں اور اسی راستے میں مٹنے کو موت نہیں بلکہ شہادت اور حیاتِ ابدی تصور کرتا ہوں۔

میں بقول اقبال اپنی کشتِ ویراں سے "ناامید" نہیں ہوں، حوادثِ عالم کے ابر اس پر برس رہے ہیں اور اس کے "نم" ہونے میں بہت تھوڑی کسر دکھائی دے رہی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اس کی "زرخیزی" ایک مرتبہ پھر دنیا کو حیران کر دے گی۔ دعا فرمایئے کہ خدا ہم کو اپنی ہدایت و رہنمائی سے بہرہ ور کرے۔ ہم سے وہی کام لے جو اس کے علم میں ملتِ اسلامیہ کے لئے مفید ہے اور اس کام سے محفوظ رکھے جو ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعی کے لئے مضر ہو۔

میرے آشیانے پر بجلی چمک رہی ہے، اس کو جل جانے دو، تمہارے لئے یہ بہار کی علامت ہے۔ یہی ابر تمہارے گلشنِ حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی۔ میں اپنے اجڑے ہوئے آشیانے کی ناگسر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤں گا۔ ہوا میں چل رہی ہیں

ابر چھٹیں گے، آفتابِ امید چمکے گا۔ اور دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور
باطل کے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتے ہوئے نظر آئیں گے:
ان کی پیشین گوئی پوری ہوئی لیکن دوسرے انداز میں، ان کے آشیانے کی نہیں بلکہ
حیدرآباد کی خاکستر پر بیٹھ کر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اقبال کا خواب حقیقت بن گیا، اور
پاکستان کے قیام سے ملت کے ویرانے میں بہار آگئی، ایسی بہار جو ابدی سکون و سرور سے
ہمکنار رہے گی، اقبال کے مردِ مومن کی سعیِ پیہم رائیگاں نہیں گئی ۔!

جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھدی!... (وحید)

حصّۂ سوم

اہلِ حیدرآباد سے اقبالؔ کے مراسم اور مراسلت

اہلِ حیدرآباد سے اقبال کے مراسم

مشہور حدیث شریف ہے کہ آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے، یوں تو اقبال کے گھر کا دروازہ ہمیشہ سب کے لئے کھلا رہتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر آنے جانے والا ان کا مزاج داں یا دوست نہیں ہوتا تھا۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی تھی جو ایک شاعرِ اعظم کے دیدار کی خاطر یا کسی نہ کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیال اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے، ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے اور جہاں تک ہم کو علم ہو سکا ہے، وہ یہی ہے کہ ان کا حلقۂ احباب بہت زیادہ وسیع نہیں تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ساری دنیا میں اقبال کے بے تکلف ملنے والوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں بہت بڑے درجہ کے حامل ہیں یہ بھی خود ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا عظیم اور ایسا مشہور اور ہر دلعزیز شاعر اور فلسفی اپنی بڑائی کے اظہار کے کم سے کم مواقع اپنے پرستاروں کے لئے فراہم کرتا تھا۔ شعر و ادب کی دنیا میں وہ کسی بڑے سے بڑے استاد سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ لیکن حقیقی معنوں میں اس کا کوئی شاگرد نہیں۔ شعر و سخن کی کون سی محفل تھی جو اس کے لئے چشم براہ نہیں تھی۔ لیکن اس نے اپنے شعر کی "ارزانی" کسی عالم میں بھی پسند نہیں کی۔ اردو کا کون سا قابلِ ذکر شاعر ہے جس نے اپنی آواز کی شعبدہ کاری (تحت اللفظ اور ترنم) اور محفلوں کی واہ واہ سے اپنے

تاجِ شہرت کو نہ سجایا ہو۔ لیکن اقبال اپنی ابتدائی زندگی کے علاوہ اس "فن" سے بھی نا آشنا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے "شاگردوں" اور "پرستاروں" کی گروہ بندیوں سے بھی بے نیاز رہا۔ ورنہ غیر منقسم ہندوستان کے ہر شہر اور ہر شہر کی ہر گلی کوچہ میں اس کے پیچھے ہاتھ باندھے چلنے والے نیاز مندوں کا کوئی شمار نہ ہوتا، اگر وہ شعر کو "پیشہ" بنا لیتا تو اس کے لئے ایسے "مظاہرین" کا ہمہ عالم پیش کرنا کچھ مشکل بات نہ تھی۔ لیکن دانائے راز اقبال بخوبی جانتا تھا کہ اس طرزِ عمل سے اردو اور فارسی زبان ایک عظیم شاعری سے محروم ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کا حلقۂ احباب بہت زیادہ وسیع نظر نہیں آتا۔ خوش نصیبی سے شاعرِ اعظم کے اس محدود حلقۂ احباب میں بھی ہمیں حیدرآباد کے چند صاحبانِ نظر کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ فہرست زیادہ طویل نہیں۔ ویسے حیدرآباد میں اقبال کے "نیاز مندوں" کی کوئی کمی نہ تھی لیکن جنہیں ان کا "دوست" کہا جا سکتا ہے ایسے خوش نصیب چند ہی ہیں۔ آگے ہم انہی کے حالات اور اقبال کے مراسم کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی

اقبال کے حیدرآبادی دوستوں میں سر فہرست مہاراجہ کشن پرشاد کا اسم گرامی نظر آتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو عام طور پر قدیم مشرقی تہذیب کی بساط کا آخری مہرہ[۱] سمجھا جاتا تھا۔ تواضع و انکسار میں بے مثال، امیر ابن امیر ہونے کے باوجود فقیر منش، خود شاعر، نثر نگار، صوفی لیکن لاتعداد شاعروں، نثر نگاروں اور صوفیوں کے سرپرست اور مداح، یار اور غمگسار بقول بہادر یار جنگ "ڈیڑے کر اترانے والے تو بہت دیکھے ہیں، ڈیرے کر شرمانے والا بھی ایک

---

[۱] مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر صفحہ ۱۲

نظر آیا۔ "اتنی خوبیوں کے انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی صغیر سنی میں جب میں اپنے جد امجد سید کاظم علی باغ (تلمیذ داغ دہلوی) کے ہمراہ ان کے ہاں گیا تھا تو میرے سلام کا جواب انہوں نے کسی ملازم کا سہارا لے کر اور نیم ایستادہ ہو کر دیا تھا۔ اب یہ باتیں خواب ہو گئیں۔ مہاراجہ کی ہستم بالشان شخصیت اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور اہمیتوں کے ساتھ حیدرآباد کی ہر جہتی زندگی کی نصف صدی پر چھائی ہوئی ہے۔ ان کے تذکرے کے بغیر حیدرآباد کی کوئی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی دسوائے اس مختصر دور کے جو موجودہ نظام کی تخت نشینی کے بعد جب وہ اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے ہیں اور بس عہد ناپرسی کے بعض اشارے آپ کو اقبال کی ان کے نام خط و کتابت میں نظر آئیں گے انہی کی ذات اور صرف انہی کی ذات حیدرآباد کی بساط پر وزیر با تدبیر کی حیثیت سے چھائی ہوئی نظر آئے گی۔ یا وہ زمانہ جب خود مہاراجہ ناسازی مزاج اور کبر سنی کے باعث وزارت عظمیٰ کے عہدے سے علیحدہ ہو گئے ہیں لیکن اس زمانے میں بھی ان کی شخصیت حیدرآباد کا محبوب ترین سرمایہ تھی، بلکہ گنڈہ باشی مہاراجہ چندو لال کا یہ جانشین ان کی شہرۂ آفاق روایات کا حامل اور نمائندہ تھا۔ مہاراجہ چندو لال کے حلقۂ ارادت میں اگر ناسخ اور شاہ نصیر دہلوی نظر آتے ہیں تو مہاراجہ کشن پرشاد کی محفل بھی اردو اور فارسی ادب کے تابندہ و درخشندہ ستاروں سے روشن ہے۔ مہاراجہ کی نشست گاہ جہاں معروف اور غیر معروف واعظوں، خطاطوں، مصوروں علم موسیقی کے ماہروں اور نجومیوں سے بھری رہتی تھی۔ وہیں ہم کو اردو اور فارسی ادب کی بہت سی تاریخی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً اردو کے نثر نگاروں میں رتن ناتھ سرشار، خواجہ حسن نظامی

لے مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر جلد ۳ شمارہ ۳ ص ۲۲

وحیدالدین سلیم، عبدالماجد دریا آبادی، عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، نیاز فتح پوری، فرحت اللہ بیگ، ہوش بلگرامی، قاضی عبدالغفار وغیرہ سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اور ان میں سے بعض تو ہمیشہ ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے اور ان کی فیاضیوں اور ہمت افزائیوں سے متمتع ہوتے رہتے تھے۔ شعراء میں ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فارسی زبان کے بعض بہت بڑے شاعروں سے ان کا یارانہ تھا جن میں غلام قادر گرامی، استاد الملک آغائے شوستری، ضیا یار جنگ ضیا، عبداللہ عمادی، مسعود علی محوی، موئید الشعراء ایرانی، مفتوں شیرازی، محمد علی داعی اسلام، طلعت یزدی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اردو زبان کے اساتذہ میں تو ان کی محفلوں کی رونق بڑھانے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اس فہرست میں داغ، امیر، حالی، شبلی، نظم طباطبائی، جلیل، ظہیر دہلوی، کاظم علی باغ، ضامن کنتوری، آزاد انصاری، فانی بدایونی، حیرت بدایونی، جوش ملیح آبادی، لبیب کنتوری، نرسنگھ راج عالی اور ماہر القادری وغیرہ کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ یہ فہرستیں نامکمل ہیں اور انہیں اس نقطہ سے پڑھا جانے کہ ادب کی یہ معروف شخصیتیں مختلف ادوار اور زمانوں میں مہاراجہ کی محفلوں کی زینت دوبالا کرتی رہی ہیں۔ ان فہرستوں میں حیدرآباد کے دو مشہور اور اہم نام امجد اور علی اختر کے ہمیں نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ ان حضرات کی قلندرانہ زندگی کے علاوہ اور بھی ہیں جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ لیکن مہاراجہ کی جوہر شناسی کا مقام اس وقت بہت بلند ہو جاتا ہے۔ جب ہم کو جدید شعر و ادب کے کارواں کے سرخیل اقبال بھی ان کے زمرہ یاراں میں نظر آتے ہیں۔ اقبال سے ان کے مراسم کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اقبال ان کے بعض اہم معاملات میں رازداں اور مشیر بھی ہیں۔ اور ادب و شعر کے سلسلے میں رہنما اور استاد بھی۔ خود اقبال کے ذہن پر مہاراجہ نے کیا اثرات چھوڑے تھے، اس کی تصویر ہمیں اقبال کی اس نظم میں نظر آتی ہے۔ جو انہوں نے

مہاراجہ کو مخاطب کر کے کہی تھی۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں لیکن مجلہ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر میں شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب کے ناظرین کے لئے یہ ایک نایاب تحفہ ہے اس لئے ہم پوری نظم یہاں نقل کرتے ہیں۔

شکریہ

"گزشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا۔ وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے۔ انہیں زبانِ قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔"

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار — صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر — کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر — محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے — بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے — سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی — کھینچتا ہو میاں کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح — جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح — شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج — ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا — آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر — عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا اے ہمصفیر آیا ترا — کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے — کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش — کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب — ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار

پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے — دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خارزار

غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں — ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا — لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلّی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی — جس کے ؟ دلوں میں شوالے ہم نوا میرا گذر

جس کے ذرّے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور — جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کل کے ہم صفیر — جس کے غنچوں کے لیے رخسارِ حور آئینہ دار

خطۂ جنّت فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل — عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار

جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے — وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمین
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پہ وزارت کے ہوا میرا گزر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

اس قدر حق نے بنایا اسکو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے ہیں نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اسکی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اسکی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیٔ معنی کا محمل اس کی نثرِ دلپذیر
نظم اس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اسکے فیضِ پاک کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروت کا یونہی لا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دل ربا اس کا تکلم خلق اس کا عطرِ گل
غنچۂ دل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جس پہ ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقہ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دستِ تعفف کار فرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو ہو سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

مذکورہ بالا نظم کے پڑھنے کے بعد اقبال اور مہاراجہ کے تعلقات کی نوعیت کسی حد تک سمجھ میں آجاتی ہے لیکن اس کی وسعت و اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب ہم خود

مہاراجہ کے مزاج سے شناسائی حاصل کریں۔

اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

"دس پانچ مرتبہ جب مجھے ان کی صحبت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی تو

ہر دفعہ شاد منزل کے اس بالائی کرہ میں مجھے مشرقی تہذیب و تمدن کے وہی گزرے ہوئے

خواب نظر آئے جن کا دامن شاہانِ مغلیہ اور دربار آصف جاہی کی قدیم روایات سے

وابستہ ہے جس طرح سینما کی متحرک تصویروں میں کبھی کبھی پردۂ سیمیں پر کسی ایک ہی تصویر کے

پس منظر سے بہت سی دوسری تصویریں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ اسی طرح میرے تصورات میں

بھی مہاراجہ بہادر کی شخصیت دربار اکبری کے کسی بست ہزاری امیر کا عکس معلوم ہوا کرتی تھی

یعنی اگر ان کے جسم پر مغلیہ دربار کا رسمی لباس کسی نے دیکھا ہوگا تو اس دیکھنے والے نے

آگرہ کے ایوانِ شاہی میں راجہ ٹوڈرمل کو دیکھ لیا ہوگا"[1]

حیدرآباد کی دوسری اہم اور ایک نوعیت سے سب سے اہم شخصیت نواب

بہادر یار جنگ کی ہے۔ ہم ان کے توسط سے مہاراجہ سے حقیقی معنوں میں متعارف ہو

سکتے ہیں۔ انہوں نے مہاراجہ کے متعلق لکھا تھا۔

"مہاراجہ کشن پرشاد ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کو ہندوستان اور دکن میں

مشرقی اور مغربی تہذیب کا سنگم کہا جاسکتا ہے ــــــ ان کی اخلاقی تعمیر عجیب ہمہ گیر

صفات کے مسالے سے ہوئی تھی۔ آج ہم کو ان کے مرتبہ رکھنے والوں کی صف میں ایک

آدمی بھی ان صفات سے متصف نظر نہیں آتا۔ اور کوئی مشغلہ تھا جس میں وہ انہی

---

[1] مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر ص ۱۰۵ [2] مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر جلد ۱۳ شمارہ ۴ ص ۳۴۵

رائے نہ رکھتے ہوں فلسفہ، تصوف، علمِ کلام، شعروادب، ہر فن کے باکمال لوگ اگر کسی کی محفل میں یک جا دیکھے جا سکتے تھے تو وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی محفل تھی۔ میں خود اپنی زندگی کی تعمیر میں ان کی ان محفلوں کا بہت بڑا حصہ تصور کرتا ہوں، اور اپنے قلب کو ان کے لئے جذباتِ شکر سے معمور پاتا ہوں۔ آج ایک بھی صحبت ایسی نہیں نظر آتی جہاں ایک عظیم المرتبت امیر ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ چمکتی ہوئی پیشانی، انکسار و تواضع کے ساتھ جھکی ہوئی گردن اور ہر ایک دل پر اپنی محبت کا سکہ جما دینے والے اخلاق کے ساتھ صدرِ بزم ہو۔ اس کے اطراف ایک طرف شاعر دوسری طرف علماء، تیسری طرف سیاستدان اور ماہرین قانون اسی طرح بیٹھے ہوں، جس طرح کوئی احباب کی بے تکلف صحبت میں بیٹھتا ہے اور ہر شخص اس محفل سے اٹھے تو اس یقین کے ساتھ اٹھے کہ مہاراجہ بہادر سب سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی بزمِ علم و امارت میں میں ہی سب سے زیادہ مقبول ہوں۔"[1]

خط کشیدہ جملوں کو غور سے پڑھئے تو مہاراجہ کی ہمہ گیر شخصیت کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ آزادیٔ حیدرآباد کے سب سے بڑے داعی اور فکرِ اقبال کے معجز بیان مبلغ بہادر یار جنگ کی ذہنی تربیت بھی مہاراجہ ہی کی محفلوں میں ہوئی۔ مہاراجہ کے کردار کی یہی خصوصیات تھیں، جن کا اعتراف اقبال نے اپنی نظم کے علاوہ مختلف خطوط میں بھی کیا ہے۔

اقبال اور مہاراجہ کی شناسائی بہت پرانی تھی، لیکن ۱۹۱۳ء کی ملاقات نے آپس میں شانی موالست و یگانگت پیدا کر دی۔ ماہِ جولائی ۱۹۱۳ء میں مہاراجہ نے اجمیر اور پنجاب کا سفر کیا تھا

---

[1] مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر ص ۹۰

۱۷ر جولائی کی رات کو ساڑھے نو بجے لاہور پہنچے تھے "سیر پنجاب" میں لکھتے ہیں۔

"اسٹیشن پر میرے بے ریا دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا موجود تھے ان سے ملا اور اپنے ڈبوں کو علیحدہ کرا کر ایک طرف قیام کیا۔"

مہاراجہ کے روزنامچے کے وہ حصے جو اقبال سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "شاد و اقبال" میں نقل کئے ہیں، ان کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"پانچ بجے شام کو میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا آئے۔ بہت دیر تک لطف صحبت رہا۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ خدا زندہ رکھے چونکہ برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہ کا مزاج اچھا نہیں ہے اس لئے حسب مشورہ ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر محمد حسین کو جو لاہور کے نامی ڈاکٹر ہیں، طلب کر کے دکھایا ....

۹ بجے پھر ڈاکٹر محمد اقبال آئے اور ان کے اصرار سے مع دو مصاحبوں کے آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں گیا۔

۲۲ ر جولائی کے روزنامچے میں لکھتے ہیں۔

"بعض اکابر و معززین برادی نے میرے لاہور میں (جو میرا جدی وطن ہے) آنے کی خوشی میں ایک جلسہ تھیٹر ہال میں منعقد کیا اور میں ۱ بجے شام کے رائے بہادر رام سرنداس و لالہ کرمچند مجسٹریٹ و ڈاکٹر محمد اقبال اور نیز دیگر معزز حضرات کی معیت میں اس جلسہ میں گیا"

۲۴ ر جولائی کی شام کو ہرکیشن تھیٹر ہال لاہور میں مہاراجہ کے استقبال کے لئے ایک دوسرا عظیم الشان جلسہ آنریبل رائے بہادر رام سرنداس کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سر پرتول چند چٹرجی نے کی اور بحیثیت صدر اپنی افتتاحی تقریر میں باشندگان لاہور کی طرف سے مہاراجہ کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعہ پر سفرنامہ میں لکھا ہے۔

ان کے بعد آنریبل رائے بہادر رام سرنداس اور ڈاکٹر اقبال بیرسٹرایٹ لا ، دسٹر اکبر عمر بیرسٹرایٹ لا و آغا حشر کاشمیری و جالب صاحب دہلوی جائنٹ ایڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت جوش اور سنجیدگی کے ساتھ پرمعنی تقریریں کیں اور ہر ایک نے اپنے حسن ظن کی وسعت میرے خاندانی اعزاز و خدمات و خطابات پر روشنی ڈالی۔

اس سفر سے واپسی کے عرصہ دراز بعد جب مہاراجہ دوبارہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے تو اقبال نے درجِ ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر ان کو بھیجا۔

صدرِ اعظم گشت شادِ نکتہ سنج	ناوکِ اُو دشمناں را سینہ سفت
سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں	جانِ سلطاں سرکشن پرشاد گفت

۱۳۴۱ھ

مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی طویل خط و کتابت اور خود مہاراجہ کی زبانی ان تعلقات کی کہانی سننے کے بعد اہلِ حیدرآباد کو فخر کرنا چاہیئے کہ ان کی سرزمین کے ایک فرزندِ جلیل میں اتنی خوبیاں تھیں کہ اس دور کا سب سے بڑا انقلابی شاعر ان کا شیدا و مداح ہو گیا اور خود بھی اس بات پر نازاں رہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد جیسا صاحبِ نظر فقیر منش امیر اس کے حلقۂ احباب میں ہے۔

اقبال کے ایک وسیع الخیال ہندو امیر سے یہ گہرے مراسم خود اقبال کی وسیع المشربی کا ناقابلِ تردید ثبوت اور ان لوگوں کے لئے جو اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر بتانے کی کوشش کرتے ہیں ایک کھلا چیلنج ہے!

---

[1] مجلہ عثمانیہ کا مہاراجہ نمبر

اکبر حیدری اور اقبال

اکبر حیدری کی شخصیت بڑی نزاعی اور عجیب ہے، جدید حیدرآباد کے بنانے اور سنوارنے میں سر سالار جنگ کے بعد جتنی اہمیت اکبر حیدری کو حاصل ہے اتنی کسی دوسرے کو نہیں لیکن سالار جنگ اور اکبر حیدری کی ذہنیتوں میں بڑا فرق تھا، سالار جنگ بہت بڑے امیر تھے اور ان کا کوئی حریف ان کی طرح ذہین، طباع اور مدبر ملک میں موجود نہیں تھا، اسی لئے جن خطوط پر وہ حیدرآباد کی تعمیر کرنی چاہتے تھے کر کے رہے، ان کو کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہیں تھا۔ سالار جنگ کی تعمیری اسکیموں میں ہمیں حیدرآباد کی وسعت اور مکمل آزادی کی خواہش چھپی ہوئی نظر آتی ہے، برخلاف ان کے اکبر حیدری کا ذہن کانگریس اور قومی تحریکوں سے متاثر رہا اور غیر منقسم ہندوستان کے نقشہ میں حیدرآباد انہیں صرف ایک ریاست ہی نظر آتا رہا، ہندو اکثریت سے آباد اور ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی ریاست — صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے وزارتِ عظمیٰ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہونے والے اکبر حیدری کی سیاسی فہم و فراست کا محور دراصل انگریز ریذیڈنٹ کی چہار دیواری تھی، انگریزوں کی اکثریت نوازی حیدرآباد میں اکبر حیدری کی حکمتِ عملی کی شکل میں کارفرما تھی۔

دینِ او آئین او سوداگری ست

عنتری اندر لباسِ حیدری ست

یہی وجہ ہے کہ آخر آخر میں مسلمانوں کا اکبر حیدری کی حکومت سے سیاسی تصادم ہوتے رہا۔ اگرچہ اکبر حیدری کی اسلام پرستی اور مسلم دوستی مسلّم ہے اور مسلمانوں کی خدمت میں وہ کسی بڑے سے بڑے مسلم لیڈر سے پیچھے نہیں ہے۔ لیکن سیاسی طور پر ان کے سوچنے کا انداز یہی تھا، چنانچہ مذکورہ بالا شعر کے متعلق بہادر یار جنگ نے اقبال سے دریافت کیا تھا کہ "حیدری" کا اشارہ اکبر حیدری کی طرف تو نہیں ہے؟ جواب میں اقبال نے لکھا تھا۔

"میں خوش ہوں کہ آپ میرا کلام اتنے غور سے پڑھتے ہیں۔"[1]

یہ روایت ہم نے خود بہادر یار جنگ کی زبان سے سنی ہے۔ اس لئے غلطی کا امکان نہیں، افسوس کہ اصل خط محفوظ نہیں رکھا گیا لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اکبر حیدری کے حیدر آباد پر بے شمار مادی اور ٹھوس احسانات بھی ہیں، برار پر نظام کے حق نیابت کا تسلیم کیا جانا، ریلوے، سکندر آباد اور علاقہ ریذیڈنسی کی بازیابی اور حیدر آباد کے مالیہ کا توازن اور شہر حیدر آباد کی توسیع و آرائش کی اسکیموں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ان کا حصہ اتنا اہم اور تاریخی ہے کہ جسے کوئی تعلیم یافتہ حیدر آبادی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہر ملکی اور "غیر ملکی" مخالفت کے آگے وہ چٹان کی طرح ڈٹ گئے اور ایک ایسی جامعہ کی داغ بیل ڈال دی جس نے ملک کے گوشہ گوشہ میں علم کی روشنی پھیلا دی اور آج بھی اکبر حیدری کا یہ عظیم الشان علمی تجربہ مادری زبان میں تعلیم کے مخالفین کے لئے نشانِ راہ کا کام دے رہا ہے۔ اگرچہ نہ اب حیدری باقی ہیں نہ حیدر آباد نہ جامعہ عثمانیہ اپنی اصلی روح کے ساتھ زندہ ہے۔ لیکن اس جامعہ کے فارغ التحصیل فرزند آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں کامیاب ڈاکٹروں،

[1] خیر علام ثاثر گرامی صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۶

انجینیروں، سائنس دانوں، دفتری کاروبار کے ماہروں، قانون دانوں، صنعت کاروں، پروفیسروں صحافیوں اور ادیبوں کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے اور منوا رہے ہیں!

اکبر حیدری کا یہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو ان کے اسم گرامی کو ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے گا اور حیدرآباد کی تاریخ کے صفحات پر ان کا نام اور کام سنہری حروف سے لکھا جائے گا اور ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

اکبر حیدری صرف ایک اعلیٰ درجے کے اڈمنسٹریٹر اور سیاسی مدبر ہی نہیں تھے۔ وہ ایک درویش صفت اور بڑے علم دوست انسان بھی تھے۔ اسی مؤخر الذکر خوبی نے انہیں اقبال کے حلقۂ احباب میں شامل کر دیا تھا۔ اقبال سے ان کے مراسم کی بنیاد ۱۹۱۰ء میں پڑی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۰ء کے خط موسومہ عطیہ بیگم فیضی میں اقبال لکھتے ہیں۔

"میں اگر حیدرآباد میں چند روز اور ٹھہر جاتا تو مجھے یقین واثق ہے کہ اعلیٰحضرت حضور نظام مجھے ضرور شرف باریابی بخشتے، میں حیدرآباد میں جملہ اکابر سے ملا اور اکثر نے مجھے اپنے ہاں دعوت پر بلایا، میرا سفر حیدرآباد بلا مقصد نہ تھا۔ بلند الملاقات عرض کروں گا۔ خاندانِ حیدری سے ملاقات ہی مقصودِ سفر نہ تھا۔ میں ان سے اس سفر میں ہی ملا ہوں قبل ازیں ان سے مجھے نیاز حاصل نہ تھا۔ بیگم حیدری کا کرم ہے کہ انہوں نے ان غایت آمیز الفاظ میں یہ ذکر فرمایا۔ مجھے ان کا اہلِ عرب کا سا جذبہ بے حد پسند آیا اور ان کے ہاں مجھے گھر کی سی آسائش میسر آئی۔ میں ان تمام امور میں جوان کی توجہ یا ہمدردی کا مرکز ہیں، ان کی فہم و فراست کا مداح ہوں، حیدری اور بیگم حیدری ہی کے اثر سے مجھے حیدرآباد

لہ اقبال نامہ حصہ دوم ص۳۳ و ۳۵

کی معاشرت کے بعض بہترین نمائندوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا، حیدری صاحب ایک پابندِ وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ ان سے ملاقات سے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے انہیں دردِ دل اور فکرِ بلند کی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کے لئے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ ایک حقیقی گھر کا نقشہ ایک تو میں نے آر نلڈ صاحب کے ہاں دیکھا تھا اور دوسرا ان کے پاس"۔

اقبال کا یہ خط حیدر آباد اور خصوصیت سے حیدری صاحب کے تعلق سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اکبر حیدری اور بیگم حیدری کے بارے میں ان کے تاثرات صاف اور صریح الفاظ میں اس خط سے ظاہر ہو جاتے ہیں، اور اس چند روزہ مہمانی اور میزبانی کے خوشگوار اثرات آگے چل کر اور استوار و مستحکم ہو جاتے ہیں تکلفات کے پردے اٹھنے لگتے ہیں اور ٹھیک سیک کی رسم راز و نیاز میں تبدیل ہو جاتی ہے ۱۹۱۰ء سے لے کر گول میز کانفرنس تک دونوں طرف غلط فہمیوں یا شکوک و شبہات کی کوئی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی اور اس پورے طویل عرصہ میں اقبال اپنے دوسرے احباب کے خطوط میں بھی حیدری صاحب کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ گول میز کانفرنس میں پہلی بار اقبال کو اکبر حیدری سے سیاسی اختلاف ہوتا ہے، لیکن اس اختلاف کا ذاتی مراسم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اقبال کے سیکر ٹری کی حیثیت سے مولانا غلام رسول مہر نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی تھی۔ اس خاص بارے میں ہم نے مولانا عبد المجید سالک کے توسط سے مہر صاحب سے کچھ استفسارات کئے تھے لیکن ان کے جواب سے معلوم ہوا کہ مولانا مہر کو اس اختلاف کا کوئی علم نہیں، لیکن اس سیاسی اختلاف سے متعلق جو روایت ہم نے بہادر یار جنگ اور حیدر آباد کے دوسرے بزرگوں سے سنی ہے وہ آپ اسی کتاب کے

باب "اقبال اور حیدرآباد" میں دیکھ چکے۔ یہاں ہم مولانا غلام رسول مہر کے جواب کا وہ حصہ
نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ سیاسی اختلاف کے باوجود اقبال
اور اکبر حیدری کے ذاتی مراسم پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مولانا مہر لکھتے ہیں (اصل خط ہمارے
ہاں محفوظ ہے)

"واپسی کے وقت ہم لوگ یروشلم کی مؤتمر اسلامی سے فارغ ہو کر پورٹ سعید سے
جس اطالوی جہاز پر سوار ہوئے تھے اس میں حیدری، مسز حیدری، صالح حیدری، مسز
صالح حیدری، ان کے دو بچے، ارماڈیوک پکتھال، شہزادہ اعظم جاہ، شہزادی درشہوار،
شہزادہ معظم جاہ، شہزادی نیلوفر بھی ہندوستان آرہے تھے۔ چنانچہ پورٹ سعید سے بمبئی
تک کھانے پر عموماً ساتھ ہو جاتا تھا اور متفرق باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں"

اقبال کی وفات سے قبل اور ان کی طویل علالت کے زمانے میں البتہ ایک واقعہ ایسا پیش
آیا جس نے ان قدیم اور رسمی تعلقات کی عمارت ہی کو منہدم کر دیا حالانکہ اس حادثے کے پس منظر
میں حیدرآباد کے چند دفتری اہلکاروں کی نااہلی اور غلط کاری کے سوا کچھ نہیں، لیکن اسی
نااہلی اور غلط کاری نے اکبر حیدری کے متعلق اقبال سے ایک ایسا غیر فانی قطعہ کہلوا دیا جس
کی وجہ سے اکبر حیدری کی شخصیت ملک میں مشتبہ ہو کر رہ گئی۔ قطعہ کے ان اشعار کو بھلا کون
بھلا سکتا ہے۔

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش

کام درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

ایک دوستانہ و نیاز مندانہ خدمت کو ایک "کلرک" کی کج فہمی نے ٭ اس کی خدائی کی زکات" بنا دیا جو حیدر آباد کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز رہنے کے باوجود ہمیشہ "درویش" رہا۔ سیاسی اختلاف کے باوجود اکبر حیدری کی بعض غیر معمولی خوبیوں کے سب قائل ہیں۔ اسی لئے ہمیں حقیقتِ حال کے کھوج کا خیال آیا چنانچہ اس سلسلے میں ہم نے نواب معین نواز جنگ سے استفسار کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"توشک خانۂ عامرہ کا محکمہ تھا ہی اس لئے کہ اس کے فنڈ سے ملک اور بیرونِ ملک کے اہلِ کمال کی مالی اعانت اور خدمت کی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں جو دفتری کاروائی ہوتی تھی وہ راز میں رہتی تھی، صاحبِ معاملہ کو اس کا کوئی علم نہ ہوتا تھا، چنانچہ اکبر حیدری اکثر اس فنڈ سے اقبال کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے وقت ایک ہندو منتظم برسرِ کار تھا، اس نے عمداً یا ناواقفیت کی بناپر چیک کے ساتھ ایک دفتری زبان میں خشک اور سپاٹ سا مراسلہ بھی اقبال کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس کو پڑھ کر ان کا برانگیختہ

٭ نواب معین نواز جنگ اکبر حیدری کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں معتمدِ بابِ حکومت (کیبنٹ سیکرٹری) کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ بعد میں وزیر مالیات اور وزیر خارجہ بن گئے تھے۔ یونائیٹڈ نیشنز میں حیدر آباد کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ آج کل کراچی میں خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ہوجانا عین فطری بات ہے ۔ افسوس کہ قطعہ لکھنے کے اور رقم واپس کرنے کے چند ہی روز بعد ان کا انتقال ہوگیا ۔ اکبر حیدری کو ہمیشہ اس کا ملال رہا کہ وہ اس غیر متوقع واقعہ کی صفائی اور تلافی نہ کرسکے۔

آج نہ اکبر حیدری زندہ ہیں نہ اقبال ؛ لیکن اقبال کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کے ساتھ یہ قطعہ بھی ۔ لیکن خدا بھلا کرے معین نواز جنگ کا کہ ان کی وجہ سے حقیقت حال کا بھی انکشاف ہوگیا ، اور ہمیں یقین ہے کہ دوستداران اقبال بھی اس انکشاف کے بعد اکبر حیدری کو کلمۂ خیر سے یاد کریں گے ، ویسے بھی اب دونوں دوست وہاں ہیں جہاں فنا کے پر جلتے ہیں ۔ اور انسانی روحوں کے سروں پر بقائے دوام کا تاج جگمگاتا ہے اور زندگی کی شعل ابد کے طاق میں درخشاں رہتی ہے اور جہاں منصفِ اعلیٰ سے ہر دردمند انسان یہ کہہ سکے گا کہ

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

مولوی عبدالحق اور اقبال

مولوی عبدالحق پیدا تو ہاپوڑ میں ہوئے اور طالب علمی کا زمانہ علی گڑھ میں گذارا لیکن اس کے فوری بعد وہ حیدرآباد آ گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے اور خاکِ دکن اس وقت تک ان کی دامنگیر رہی جب تک ان کی محبوب اردو پر کسی آنچ کے آنے کا اندیشہ نہ تھا۔ وہ اورنگ آباد کی پرسکون فضا میں آبادی سے دور مقبرۂ رابعہ درانی کے ایک خاموش گوشہ میں مدتوں علم و تحقیق کا چراغ روشن کئے مرکزِ اہلِ نظر بنے رہے لیکن جب اردو پر سیاسی بازیگروں کی طعن و تشنیع کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ میدانِ عمل میں کود پڑے اور اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہو گئے لیکن اس نقل مکانی تک مولوی صاحب اپنی زندگی کے لگ بھگ پچاس سال حیدرآباد کی نذر کر چکے تھے۔ آصفیہ ہائی سکول کی ہیڈ ماسٹری سے لے کر انجمن ترقی اردو کی اعزازی معتمدی، اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی اور آخر میں جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو کی صدارت تک وہ حیدرآباد میں جو چاہتے بن جاتے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بساطِ سیاست پر ان کی حیثیت شاطر کی سی تھی، اس کے باوجود اردو ادب کی خدمت ہی کو انہوں نے ہر منصب سے اعلےٰ جانا، بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حیدرآباد کی بڑی بڑی تبدیلیوں میں مولوی عبدالحق کی چشم و ابرو کے اشاروں کا کتنا دخل رہا ہے۔

انجمن کی منتقلی کے سلسلہ میں انہوں نے اقبال سے بھی مشورہ کیا تھا اور اقبال نے اس خیال کو سراہتے ہوئے انہیں لکھا تھا کہ

۵ آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں، میرے خیال میں صرف دو باتیں زیر بحث آئیں گی، اول یہ کہ فنڈ کہاں سے آئے گا، عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ امراء توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان امراء مقروض ہیں۔ دوم یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو، میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیئے اور اس کے لئے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہوگا پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی کیونکہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزمگاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے

اس کے بعد اقبال نے دو اور وجوہ بیان کی تھیں، ایک یہ کہ لاہور پبلشنگ کا بڑا مرکز ہے اور دوسری یہ کہ اہل پنجاب صحرانشینوں کی طرح سادہ دل ہوتے ہیں اور ان میں اثرات قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ بہر حال مولوی صاحب نے اقبال کے پیمبرانہ مشورے کو نہ قبول کیا اور دہلی کو انجمن کا مستقر قرار دے دیا گیا پھر تقسیم ملک کے بعد جو قیامت انجمن پر ٹوٹی اس کا سب کو علم ہے اقبال کی بصیرت نے تو بہت پہلے دیکھ لیا تھا لیکن خود مولوی صاحب کو بھی یہ روز بد دیکھنا پڑا کہ اپنے ہی گھر سے اور اپنے ہی دفتر سے، فوجی پہرہ داروں کی نظر بچا کر انہیں بعض قیمتی مخطوطات کو اپنے کپڑوں میں چھپا کر لانا پڑا اور اپنے ایک قدیم کرم فرما مولانا ابوالکلام آزاد کی شانِ میزبانی کی اس طرح پذیرائی کرنی پڑی کہ ایک طرف مولانا آزاد کی کوٹھی مختلف مہمانوں کے قہقہوں سے گونج رہی ہے اور طعام و کلام کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور دوسری طرف ایک خاموش کمرہ میں مولوی صاحب اپنے کھانے کا انتظار کر رہے ہیں، کہ کسی نہ کسی طرح زہر مار کرلیں، یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں اور ان پر شاید ہی کسی کو یقین آئے اور ہو سکتا ہے کہ خود مولوی صاحب ان واقعات

۵ اقبال نامہ

کو من گھڑت کہہ کر ٹال جائیں، لیکن ایک سفید ریش بزرگ کا محض ذوقِ علم کی بناء پر اپنے پسندیدہ
مخطوطات کو کپڑوں میں چھپا کر لے آنا اور نازک حالات کی وجہ سے مولانا آزاد کی مصلحت اندیشی سے
مولوی صاحب کا ایک گوشہ میں خاموش بیٹھے رہنا، یہ اتنی دلچسپ اور غیر معمولی باتیں ہیں کہ شاید
ہی کسی کو یقین آئے لیکن واقعات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔

مولوی صاحب سے اقبال کے مراسم قدیم ہیں، مولوی صاحب بھی ان لوگوں میں سے ہیں
جو یہ چاہتے تھے کہ اقبال کو بھی حیدرآباد کھینچ لیا جائے، خصوصاً قیامِ جامعہ عثمانیہ کے زمانے میں
انہوں نے اس سلسلے میں بہت کوشش کی تھی۔ اقبال سے مولوی صاحب کی ملاقاتوں کی تفصیلات
تو زیادہ نہ معلوم ہو سکیں لیکن ان کی ایک تقریر سے صرف دو ملاقاتوں کا حال معلوم ہو سکا ہے۔ یہ
تقریر مولوی صاحب نے ریڈیو پاکستان سے ۲۱ اپریل ۵۲ء میں نشر کی تھی، اس میں وہ فرماتے
ہیں کہ اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے اور بہت سی تدبیروں کے علاوہ ان کے پیشِ نظر یہ تجویز
بھی تھی کہ ہر صوبے اور ریاستوں میں اردو زبان کی ترقی کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ اس
سلسلے میں وہ لاہور تشریف لے گئے اور اقبال سے بھی ملے، ان کے سامنے مولوی صاحب نے
اپنی تجویز بیان کی اور کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ سارے ہندوستان میں اردو کی اشاعت کا جال پھیلا
دوں" یہ سن کر اقبال نے کہا کہ "صرف ہندوستان میں؟" پھر مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ تین لفظوں
کا انتہائی مختصر جملہ بہت پر معنی تھا۔ یعنی وہ اردو کو صرف برِ عظیم پاک و ہند ہی کی نہیں سارے ایشیا
کی ممتاز زبان دیکھنا چاہتے تھے"۔

۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ سالانہ کے موقع پر یوم اردو بھی منایا گیا تھا اس کی
صدارت مولوی صاحب نے کی تھی۔ اس موقع پر اقبال نے ان کی دعوت کی۔ مولوی صاحب کا
بیان ہے کہ اقبال دن ہی میں کھانا کھا لیتے تھے۔ رات کو نہیں کھاتے تھے اور برعکس ان کے

مولوی صاحب صرف رات کو کھانا کھاتے تھے۔ اقبال نے مولوی صاحب کی خاطر اپنا پروگرام بدل دیا اور ان کے ساتھ شریکِ طعام رہے۔ اس دعوت میں مولانا ظفر علی خاں اور چودھری محمد حسین بھی شریک تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جو مسئلہ زیر بحث آیا وہ آج بھی بہت اہم ہے۔

رسم الخط کا قضیہ پاکستان میں پھر موضوع بحث بن گیا ہے۔ اس دعوت میں یہی مسئلہ زیر بحث آیا تھا اور اس موضوع پر اقبال کے خیالات سے استفادہ نہ کرنا بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی اقبال نے مولوی صاحب سے کہا تھا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کریں کہ ہم اردو رسم الخط کبھی نہیں چھوڑیں گے!"

کاش رسم الخط کے تعلق سے استصواب رائے کا شوشہ چھوڑنے والوں کو اقبال کے اس فیصلہ کا بھی علم ہوتا۔

اوپر جن ملاقاتوں کا حال بیان کیا گیا یہ اس وقت کی ہیں جب مولوی صاحب نے اورنگ آباد سے ہجرت نہیں کی تھی اور انجمن کا دفتر بھی دہلی منتقل نہیں ہوا تھا۔

مولوی صاحب آجکل بہت دل برداشتہ سے رہتے ہیں اور صحت بھی رگر چلی ہے اسی لئے ہم ان سے حسب دلخواہ مواد حاصل نہ کر سکے۔ پھر بھی جو کچھ پیش کیا گیا وہ مقدار میں کم سہی کیفیت میں کم نہیں۔ خدا ان کو جلد صحت و توانائی عطا کرے تاکہ اردو کی سدا سہاگن کے خط و خال میں یہ پیر جواں تازہ رنگ بھر سکے۔

مسز سروجنی نائیڈو اور اقبال

چٹو پادھیا خاندان کی یہ نامور خاتون حیدرآباد کے علم وادب کی مانگ کا سیندور ہے۔ایک ایسا روشن ستارہ، جس کی تابناکیوں سے ہندو سندھ کی سرزمین مدتوں جگمگاتی رہی، شاعر ادیب، مقرر، ایک قوس قزح اور ہزار رنگ! — بنگال کا جادو ان کی تقریروں میں سمٹ آیا تھا۔اور کبیر داس کی بے تعصب روح ان کی شاعری میں دوبارہ زندہ ہوگئی تھی، اس ساز کے آہنگ میں شیام کی بنسری کی مدھر تانیں بھی تھیں اور حمد و نعت کی پرسوز حلاوت بھی! حیدرآباد کی سیاست میں انہوں نے کبھی عملاً حصہ نہیں لیا لیکن شعروادب کی ہر محفل کی شمع بھی وہی تھیں اور صدر بھی۔ سماجی زندگی میں ان کی حیثیت ایک ہمدرد بہن اور شفیق ماں کی سی تھی۔سب کے دکھ درد میں برابر کی شریک، خلیق، ملنسار، مسلسل برسنے والا ابرِ کرم! جس میں ابھرنے کی صلاحیت دیکھی اس ممتا کی ماری نے اسے سینے سے لگایا، حوصلوں کو بڑھایا اور جہد و عمل کی ایک نئی روح اس میں پھونک دی۔حیدرآباد کو شہر گوہر سی[1] کہتی تھیں اور اہلِ حیدرآباد کو دیوانہ وار چاہتی تھیں اپنے بچوں کی طرح!

شاعر سروجنی پر سیاست دان سروجنی کبھی فتح نہ پا سکی، یہی وہ بے پناہ خوبی تھی کہ زندگی

---

[1] حیدرآباد کے متعلق سروجنی نائیڈو کی ایک نظم۔

بھ نیشنل ازم کی خدمت کرنے اور کانگرس کی صفِ اوّل کی رہنما ہونے کے باوجود وہ مسلم لیگی اقبال
تصورِ پاکستان کے خالق اقبال، اور دو قومی نظریئے کے رہنما اقبال کی ہمیشہ مداح اور دوست رہیں
اقبال کے لاتعداد شعرا نہیں حفظ تھے اور اکثر اپنی انگریزی تقریروں میں ان کو بے تکلف استعمال
بھی کرتی تھیں، بہت پرانی بات ہے یعنی دسمبر ۱۹۱۱ء کی، اقبالؒ نے اپنی چند نظمیں عطیہ بیگم فیضی کو
بھیجیں اور یہ ہدایت بھی کر دی کہ ان کو سروجنی نائیڈو کو بھی سنایا جائے۔ غالباً اس ہدایت سے
عطیہ بیگم کے اندر کی عورت جاگ اٹھی اور انہوں نے اقبال کو لکھ بھیجا کہ "سروجنی اردو شاعری کی قدر
نہیں کر سکتی"۔ اس رائے کے بارے میں خود عطیہ بیگم فیضی کی کتاب کے مترجم ضیاءالدین احمد برنی
نے جو نوٹ لکھا ہے وہ ملاحظہ کیجئے۔

"میرے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسز نائیڈو اقبال کے اشعار سے خوب
لطف اندوز ہوتی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اردو شاعری سے بھی شاعر ہونے کی وجہ سے استفادہ
کرتی تھیں، انہیں فارسی کے بھی بہت سے اشعار یاد تھے جن کا وہ برمحل استعمال کیا کرتی تھیں، میرے
خیال میں وہ اقبال کی بے حد قدر دان تھیں، راقم الحروف نے بمبئی میں متعدد مرتبہ مسز نائیڈو کو
اقبال کا تازہ کلام سنایا اور انہوں نے نہ صرف اسے گہری دلچسپی سے سنا بلکہ ایسی داد دی جس
کی توقع صرف ایک شاعر ہی سے ہو سکتی ہے۔"

کلامِ اقبال سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ جب اقبال کی زندگی میں اہلِ حیدرآباد نے پہلا
یومِ اقبال منایا، تو مسز نائیڈو حیدرآباد میں نہ تھیں لیکن جیسے ہی ان کو اس تقریب کی اطلاع
ملی انہوں نے تار کے ذریعہ یہ پیام روانہ کیا۔

"میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا عظیم ترین شاعر سمجھتی ہوں۔ اس شاعر

۱؎ اقبال از عطیہ بیگم

کے اردو اور فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست رہبر ثابت ہوں گے۔

سروجنی نائیڈو کے اس مختصر سے پیام میں اقبال سے ان کے مراسم اور کلامِ اقبال کے بارے میں ان کی رائے کا واضح اظہار موجود ہے، تار کی زبان میں انہوں نے اپنے دل کے سب تار چھیڑ دیئے ہیں!

سروجنی کا یہ بہترین دوست[2] خود ان کی کتنی قدر کرتا تھا، اس کا ایک واقعہ مولانا مظفر حسین شمیم[1] کی زبانی سنئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ غالباً ۳۶ء کی بات ہے کہ وہ اور مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مسز نائیڈو کی آمد کی اطلاع ملی، اقبال کی طبیعت اگرچہ ناساز تھی لیکن ان کے استقبال کے لئے وہ خود اٹھ کر گئے۔ یہ دونوں حضرات بہت دیر تک باہر کی نشست گاہ میں بیٹھے رہے۔ سروجنی نائیڈو اور اقبال ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے رہے اور جب وہ جانے کے لئے اٹھیں تو ان کے منع کرنے کے باوجود اقبال انہیں موٹر تک چھوڑنے کے لئے گئے اور واپس آکر بہت دیر تک مسز نائیڈو کی تعریف کرتے رہے۔

سروجنی نائیڈو کی زندگی بہت مصروف اور ایک جہاں گرد کی سی زندگی تھی۔ وہ ہمیشہ سفر ہی میں رہتی تھیں اسی لئے اقبال بعض ان کے اور اپنے مشترک احباب سے خطوط کے ذریعہ ان کا پتہ بھی پوچھتے رہتے تھے۔ اسی سے یہ خیال گزرتا ہے کہ ان دونوں میں مراسلت کا سلسلہ بھی رہا ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہم مسز نائیڈو کے نام اقبال کے خطوط حاصل نہ کر سکے۔ ویسے خود ہم نے ان کی محفلوں میں بارہا اقبال کا تذکرہ ان کی زبانی سنا ہے، وہ اقبال کی بہت مداح تھیں اور ان کی دوستی پر ہمیشہ فخر کرتی تھیں۔

---

[1] مولانا مظفر حسین شمیم ایک سیلانی بزرگ ہیں، مدتوں کلکتہ، بمبئی اور لاہور کے اخبارات میں کام کر چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے مہتمم کی حیثیت سے اورنگ آباد اور حیدرآباد میں بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ [2] دیکھئے اقبال نامہ

بہادر یار جنگ اور اقبال

سن[1] لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے ۔۔۔ میرے دوست! جسمانی ناپاکی دور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے جس کو دھونے کے لئے خدا نے انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی تھیں۔ کیا ان ناپاکیوں کا مرکز بن کر، جھوٹ کو اپنے روزمرہ کا شعار بنا کر، مکر و فریب میں مبتلا رہ کر، ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ ۔۔۔ اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی گوشوں میں خود مختار حکومتیں مل بھی گئیں تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوں گی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔ مکر و زور کی سیاست طالبانِ پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی، آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک کرنا شروع کرے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہو جائے! سن لو اور یاد رکھو کہ اسلام کے عہدِ آخر کا سب سے بڑا مفکر کیا کہہ رہا ہے؟

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

---

[1] تذکرۂ ملت از غلام محمد ص ۲۲

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی طبیعت میں خوئے اسد اللہی!

مذکورہ بالا اقتباس اردو زبان کے فقید المثال خطیب، فکرِ اقبال کے آتش بیان مبلغ اور قائد اعظم کے دستِ راست جواں مرگ بہادر خاں کی اس مشہور تقریر کا ایک حصہ ہے جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۴۳ء میں آخری بار کی تھی، آخری بار اس لئے کہ اس اجلاس کے چند ماہ بعد وہ رحلت فرما گئے تھے۔ وہ مطرب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔

جس کی صدا تھی ملوّثِ برقِ فنا سمیں"

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ اس ذہنیت کا آئینہ دار ہے جو فکرِ اقبال کے عمیق گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔ قائد اعظم کی زبان سے خود اپنی زندگی میں ایسے توصیفی کلمات سننے کے بعد کہ

"اعلیٰحضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں ہے لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے ہیں"

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سپاہیوں سے پہلے ایک ایک سپہ سالار کو پاک بننے کی تلقین ایک مردِ حق آگاہ کی مثال پیش کرتی ہے جسکی طبیعت میں "خوئے اسد اللہی" کا کوئی نہ کوئی پرتو ضرور ہوتا ہے!

بہادر خاں نے بہت کم عمر پائی تھی ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۴ء میں اس فانی زندگی کے علائق سے چھوٹ کر ایک غیر فانی زندگی سے ہم کنار ہو گئے یعنی اس چمن کے مقدر میں پوری چالیس بہاریں بھی نہیں لکھی تھیں، لیکن اس مختصر سی زندگی میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں ان کے ہاتھوں انجام پا گئے اسی تھوڑی سی مدت میں انہوں نے امارت کے آغوش میں پل کر اس کی کثافتوں سے نجات بھی حاصل کر لی، عالمِ اسلام کی سیاحت بھی کی اور حجِ بیت اللہ اور روضۂ نبویؐ کی زیارت سے بھی مفتخر ہوئے۔ اور اس سیاحت کا حاصل ہندوستان میں اس طرح پیش کیا کہ خواجہ حسن نظامی کو لکھنا پڑا

رحلت ص۱

"موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی سیر کی اور سفرنامے لکھے، جن میں سے ایک میں بھی ہوں اور مرحوم مولانا شبلی بھی ہیں، اور محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار بھی ہیں اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنہوں نے اسپین کا بہت اچھا سفرنامہ لکھا ہے اور مرحوم حافظ عبدالرحمٰن امرتسری بھی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو دیکھا ہو اور مذہبی اور سیاسی اور معاشرتی مقاصد سامنے رکھ کر دیکھا ہو۔ اس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ سب سیاحوں کے امام ہیں"[1]

اس سیاحت کے بعد تن آسانی سے اتنی سرگرانی بڑھی کہ جنگل جنگل کی خاک چھانی اور پانچ ہزار نفوس کو مشرف بہ اسلام کیا، سیاست کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنی اصابت رائے، جوشِ خطابت اور خلوص کی وجہ سے قائدِ اعظم کے منظورِ نظر اور اسلامیانِ ہند کی تمناؤں کے ترجمان اور امیدوں کے مرکز بن گئے چنانچہ عبدالماجد دریا آبادی کو اعتراف کرنا پڑا کہ

"ہندوستان نے اگر دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا، وہی اخلاص، وہی دینی جوش وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی، وہی ہمت و عزم، بجز محمد علی کی انگریزی انشاپردازی کے سب کچھ وہی"[2]

شعر و ادب سے خلقی ربط رکھتے تھے اور بڑے خلیق انسان تھے۔ اسی لئے خُلق تخلص اختیار کیا اور اپنی شعر فہمی اور سخن سنجی کا لوہا اس طرح منوایا کہ ان کے انتقال کے کئی برس بعد "ستائش کی تمنا" اور "صلے کی پروا" کئے بغیر رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے اپنے نئے مجموعۂ کلام "آتشِ گل" کو ان الفاظ کے ساتھ ان کے نام سے معنون کیا۔

---

[1] تاثرِ ملت ص۱۹ [2] تاثرِ ملت ص۱۰

میں لہٰذا اس مجموعہ کلام کو قائد ملت مولوی بہادر خاں مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی و ادبی فرض تصور کرتا ہوں، جو سراپا گداز، مجسم اخلاص فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور ایک جری انسان تھے جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا۔

وہ بیک وقت تمام محاسن شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا۔ خدائے رحمان و رحیم ان کی روح کو اپنا قرب خاص عطا فرمائے؟

اسی شعر فہمی اور سخن سنجی نے ان کو پہلے پہلے فکر اقبال کا مرتبہ دان بنایا اور آخر آخر میں عارف ہندی ان کے مرشد معنوی بن گئے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک فقرہ بہت مشہور ہے۔

"کسی کا مہدی کوئی اور ہو تو ہو، میرا مہدی اقبال ہے۔"

یہ فقرہ اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ بہادر خاں نسلاً فرقہ مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے، سچ ہے

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اقبال سے بہادر یار جنگ کی ملاقاتوں اور روابط کی تفصیلات تو انہیں کے ساتھ دفن ہو گئیں اور مراسلات بھی انقلاب حیدرآباد کے وحشت ناک دور میں ضائع ہو گئے صرف ایک خط حاصل ہو سکا جو اقبال نے کشمیری مسلمانوں کی امداد کے سلسلہ میں ان کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا، یہ خط اسی کتاب کے حصۂ مکتوبات میں شامل ہے۔ اس ایک خط کے مطالعہ سے بھی دونوں کے روابط کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

لہ قائد ملت ص ۲۲۵

گمان غالب یہ ہے کہ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ یہ زمانہ بہادر خاں کے سنِ شعور کا تھا اور وہ مہاراجہ کشن پرشاد کی محفلوں میں باقاعدہ اور بالالتزام شرکت کرنے لگے تھے۔ اقبال ۱۹۲۹ء میں دوسری بار حیدرآباد گئے تھے اور ان کے اعزاز میں مہاراجہ نے بڑی شاندار دعوتیں کی تھیں اور ایک تاریخی مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا، انہیں دعوتوں میں بہادر خاں اقبال سے متعارف ہوئے ہوں گے۔ ایک، اقتدارِ اسلامی کے احیاء کا داعی تھا اور ایک خدمتِ اسلام کے جذبات سے سرشار، یہی وجہ تھی کہ دونوں کے مراسم میں استحکام پیدا ہوتا گیا اور آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا، مشوروں اور مذاکروں کی صورت بھی پیدا ہوئی اور اس طرح ایک نکتہ رس کو ایک دانائے راز کی قربت کا شرف بھی حاصل ہو گیا اور اسی قربت نے بہادر خاں کو شانِ امارت سے بے نیاز اور سراپا ایثار و مجسم عمل بنا دیا۔ اقبال سے ان کی ملاقاتوں کے سلسلے میں ایک اشارہ سا ان کی اس تقریر میں ملتا ہے جو انہوں نے اقبال کے جلسۂ تعزیت میں کی تھی۔ فرماتے ہیں:

> بہتر نا ہے غلط حیدرآباد سے کچھ اس طرح ناآشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصورِ مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی۔ اور آج ان کے انتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفۂ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔[1]

خط و کتابت کے تعلق سے ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ دونوں میں مراسلت کا سلسلہ ۱۹۳۱ء کے بعد شروع ہوا، کیونکہ اقبال کا جو خط ہمیں حاصل ہو سکا ہے، وہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کے

---

[1] بہادر یار جنگ کی سیاسی تقاریر ص۵

ذریعہ بھیجا گیا اور اس کی وجہ اقبال نے یہ لکھی ہے کہ نواب صاحب کا پتہ انہیں معلوم نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس سے پہلے دونوں میں خط و کتابت ہوتی تو ان کا پتہ بھی اقبال کے پاس ضرور ہوتا۔ یہی بات اس لئے قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بہادر خاں کی عملی جد و جہد کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوتا ہے اور اسی زمانے میں ان کے کردار اور گفتار کے چرچے حیدرآباد کی سرحدوں سے باہر پہنچنے لگے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ایک خوش پوش اور سخن سنج حیدرآبادی نواب کی حیثیت سے اقبال سے ملے ہوں گے لیکن ۳۱ء کے بعد جیسے جیسے ان کی قومی خدمات کی شہرت اقبال تک پہنچنے لگی ہوگی ویسے ویسے قدرتاً یہ رسمی تعارف مستحکم دوستی میں مبدل ہو گیا ہوگا۔ کلامِ اقبال سے ان کو ایسا شغف تھا کہ اس کی تشریح و توضیح کے لئے انہوں نے اپنے گھر میں حلقۂ درسِ اقبال بھی قائم کیا تھا، اور عجیب اتفاق ہے کہ اسی حلقے کے درس سے اٹھ کر وہ اپنے ایک عزیز دوست ہاشم یار جنگ کے ڈنر میں گئے اور کھانے سے پہلے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجد سے اقبال کے اس شعر

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے کہ حقے کے پہلے ہی کش کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

گویا شاہینِ بلند پرواز کا "ذوقِ سفر" اسے "ہر اک مقام سے آگے" لے کر چلا گیا!

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا

اہلِ حیدرآباد سے اقبال کی خط و کتابت

مکتوب نگاری اصل میں انسانی فطرت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اسے "نصف ملاقات" کے مطالعہ سے باہمی روابط کے بہت سے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ اقبال اپنے مراسلات کو غالب کی طرح مکالمات بنادینے کا دعوےٰ تو نہیں کرسکتے لیکن ان کے خطوط میں جس شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، وہ بہت سیدھی سادھی، سچی اور بڑی دلآویز، بردبار اور وضعدار شخصیت ہے۔ اپنے وقت کی تہذیب کی نمائندہ! جوانوں کی حوصلہ افزائی، ہم چشموں کی دلجوئی، دوستی کا نباہ اور بزرگی کا پاس، ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر نپی تلی اور جچی ہوئی نظر آتی ہے۔ امراء سے خطاب کرنے کا سلیقہ انہیں آتا تھا، علماء سے کچھ سیکھنے اور انہیں کچھ سکھانے کے آداب سے وہ واقف تھے۔ سیاسی رہنماؤں کو قائل کرنا وہ جانتے تھے معترضین کو مطمئن کرنے کے ڈھنگ اور طالب علموں کی تشنگیٔ علم کو بجھانے کے گُر سے وہ کماحقہٗ آشنا تھے۔ مکتوباتِ اقبال کی سیر کیجئے، جابجا اس کی مثالیں ملتی جائیں گی۔

حیدرآباد کے جن لوگوں سے ان کی خط و کتابت رہی۔ ان میں سے صرف چند ناموں سے دنیا آشنا ہوئی ہے لیکن ان میں بھی امیر، عالم اور طالبعلم بھی نظر آتے ہیں اور ان سب کو بھی اقبال نے اپنے دل کی دھڑکنیں سنادی ہیں۔ یہ خطوط بھی اقبال کے خلوص سے معمور ہیں۔ شادِ اقبال جب پہلی بار شائع ہوئی ہے تو بعض کوتاہ اندیشوں نے اس پر عجیب و غریب حاشیہ آرائی کی تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ اقبال جاہ پرست تھے اسی لئے انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو "سرکار والاتبار" وغیرہ جیسے

القاب سے مخاطب کیا ہے اور کسی کا خیال تھا کہ یہ کتاب مقامِ اقبال کو گرانے کیلئے شائع کی گئی ہے یہ دونوں باتیں بہت ہی سطحی اور حقیقت سے بعید ہیں اس کی تردید خود اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

۲ مارچ ۱۹۱۶ء کے خط میں مہاراجہ کو لکھتے ہیں۔

"مجھے جو خلوص سرکار سے ہے، اس راز کو معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں، یہ راز مضمر ہے اس دل میں جو اللہ تعالےٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس چیز پر جاکر ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے الحمد للہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ انشاء اللہ ہو گا۔ انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پروردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دلِ غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے"

ایسی "نگاہِ بلند" اور "دلِ غیور" رکھنے والے پر جاہ پرستی کا الزام کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں "سرکار" اور "سرکار والا تبار" وغیرہ کی مخاطبت پر لوگ کھٹکتے ہیں اور یہ غلط فہمی ان کو حیدر آباد کے علم مجلسی سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اقبال جس صدی کی پیداوار، جس علم و فراست کے مالک اور جس تہذیب کے وارث تھے، اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ انسانی مراتب کا پاس ملحوظ رکھتے اور اس اعلیٰ ظرف انسان نے یہی کیا، ہمارے اُتھل زمانے کی سطحی نگاہیں ان رموز کو مشکل سے سمجھ پائیں گی، رہا یہ خیال کہ شاد و اقبال[1] ان کے مرتبہ کو گرانے کے لئے شائع کی گئی ہے، سو اقبال نامہ کے مرتب شیخ عطا اللہ کی اس رائے کو پڑھنے کے بعد اس کی اہمیت بھی وہم سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

اقبال کے خطوط کے اولین مجموعہ کی اشاعت کا شرف و فخر جناب محی الدین قادری پروفیسر ادبیات

---

[1] اقبال نامہ ص۱۳۱

جامعہ عثمانیہ کیلئے مقدر ہو چکا تھا انہوں نے اقبالنامہ یعنی پیشِ نظر مجموعہ کی جلد اول کی اشاعت سے قبل "شاد اقبال" کے نام سے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد (حیدرآباد) کی باہمی خط و کتابت جو متعدد اخبارات سے باہم بہم شائع کر دی۔ میں جملہ عقیدتمندانِ اقبال کی طرف سے ان کی خدمت میں دلی تشکر کا ہدیہ پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے "شاد اقبال" کے اس انتخاب کی اقبالنامہ کے حصہ دوم میں شمولیت کی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی، قارئینِ کرام اور دوستدارانِ اقبال "شاد اقبال" کے مطالعہ سے اقبال سے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

خط کشیدہ جملوں پر غور کیجئے اس خیال کا کھوکھلا پن واضح ہوتا چلا جائے گا۔ ہم یہاں جن خطوط کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ان میں سے تقریباً سبھی اقبالنامہ اور نقوش کے مکاتیب نمبر وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط جن حضرات کے نام لکھے گئے ان کی فہرست زیادہ طویل نہیں، یہ علی الترتیب مہاراجہ کشن پرشاد، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عباس علیخاں لمعہ، نصیر الدین ہاشمی، مسز صغرا ہمایوں مرزا، پروفیسر الیاس برنی، تمکین کاظمی، بہادر یار جنگ، تصدق حسین تاج ہیں اور ایک خط جو تمکین کاظمی کے توسط سے نقوش کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوا ہے۔ وہ میر ولی اللہ خوش نویس کے تعارف کے لئے لکھا گیا تھا وہ کس کے نام لکھا گیا تھا اس کا پتہ نہیں چلتا، ہو سکتا ہے کہ ولی اللہ صاحب کی خوشنویسی کا صداقت نامہ اور ان کی خاندانی وجاہت کا ایک عام تعارف ہو، کیونکہ اس کا اندازِ تحریر ہی ایسا ہے۔ صاحب موصوف کے بزرگانِ خاندان کے تعارف کے بعد اقبال نے خط کو اس جملہ پر ختم کیا ہے۔

"میرے نزدیک اس خاندان کے افراد مستحقِ امداد ہیں"

مہاراجہ کشن پرشاد کے موسومہ خطوط بعض اعتبار سے بہت اہم ہیں، کیونکہ ان کے مطالعہ سے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۶ء تک اقبال کی علمی، شعری اور سیاسی مصروفیات کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں اور بعض نظمیں کہاں اور کن حالات میں کہی گئیں اس کا علم بھی ہو جاتا ہے مثلاً یکم نومبر ۱۶ء کے خط کے

دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی اسرارِ خودیؔ کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لاہور سے باہر ایک گاؤں میں لکھا گیا اور یہ کہ اسی زمانے میں ان کے ذہن میں اطلیم خوشحال کے عنوان سے ایک نظم لکھنے کا خیال پیدا ہوا جس میں وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں اور ان کے عام حالات در جذبات وخیالات کیا ہوتے ہیں۔ غالباً یہ خیال نظم کی شکل اختیار نہ کر سکا۔

۹ ؍مارچ ۱۹۱۹ء کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو قوالی سننے کا بھی شوق تھا، اور اسکے بعد کا خط ظاہر کرتا ہے کہ وہ رامائن کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ خود حیدرآباد کے مسائل سے ان کی دلچسپی اور واقفیت، ان کے قانونی مشورے، مسئلہ برار کے حل کا طریقہ، علی امام کے متعلق ان کی رائے، اس قسم کی بے شمار باتیں ان خطوط کے ذریعہ علم میں آتی ہیں۔

مولوی عبدالحق کے موسومہ خطوط سے اقبال کی اردو دوستی کا ثبوت ایک ایک نقطہ سے واضح ہے بلکہ ۲۰؍اپریل ۱۹۳۷ء کے خط میں وہ صاف لفظوں میں اپنی اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا! آمدنشینان حکومتِ پاکستان کو تصورِ پاکستان کے خالق کی اس تمنا سے واقف کروانا ضروری ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام سے اقبال نامہ کی اشاعت سے قبل خود اہلِ حیدرآباد بہت کم واقف تھے لیکن ان خطوط کے مطالعہ سے، ان کی صلاحیتوں سے تعارف حاصل ہوتا ہے، افسوس ہے کہ اقبال سا سخن سنج جن کی صلاحیتوں کا معترف ہے وہ حیدرآباد میں اتنے گمنام رہے اور بعض جگہوں پر تو اقبال کے قلم سے ایسے توصیفی جملے نکل گئے ہیں کہ شبہ کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے معلوم نہیں شیخ عطاء اللہ کو اصل خطوط بھی ملے یا نہیں۔ یہی بات کتنی چونکا دینے والی ہے کہ اقبال جو ہمیشہ اصلاحِ سخن سے پہلو تہی کرتے تھے وہ لمعہ کو نہ صرف اپنے مشوروں سے مستفید کرتے ہیں بلکہ مسلسل اصلاحیں بھی دیتے ہیں، دوسری عجیب بات ہے کہ لمعہ بیک وقت اقبال کی طرح ٹیگور سے بھی بہت قربت

رکھتے تھے چنانچہ ان خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں کی سعی و کوشش سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا اور بنگلور لاہور کے دوران قیام میں اقبال کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر گئے۔ بہر حال لمعہ سے اقبال کی طویل خط و کتابت بہت دلچسپ اور قابل دید ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا کے نام خطوط کم ہیں اور رسالہ النساء کے بارے میں زیادہ تر رسمی سے ہیں البتہ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مسز صغرا بھی ایک آدھ نظم میں اقبال کی اصلاح سے مستفید ہوئی ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی کے نام دو خط ان کی مرسلہ کتابوں کے شکریہ کے طور پر لکھے گئے ہیں، جن میں کتابوں پر رائے بھی دی گئی ہے اور ان کے کام کو سراہا بھی گیا ہے۔

پروفیسر الیاس برنی علم معاشیات کے ماہرین میں سے ہیں۔ ان کے نام بھی پہلا خط برنی صاحب کی مرسلہ کتاب کے شکریہ کے طور پر لکھا گیا ہے اور اس رائے کے ساتھ کہ یہ علم اقتصاد کے سلسلے میں اردو میں پہلی مکمل کتاب ہے۔ بعد میں تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور مسئلہ قادیانیت پر برنی صاحب کے کام کو سراہا جاتا ہے اور صحت و علاج کے سلسلہ میں بھی مراسلت ہوتی ہے۔

تمکین کاظمی مزاح نگار کی حیثیت سے معروف و متعارف ہیں لیکن چونکہ داغ کے مشہور حیدرآبادی شاگرد تجلی کے فرزند ہیں۔ اسی لئے شاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں اسی سلسلے میں اقبال سے مراسلت کی تھی۔ اسرار خودی کا بھی اردو میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے لیکن اقبال کی طرف سے انہیں ترک شعر کا مشورہ دیا گیا جو قبول کر لیا گیا۔

صدق حسین تاج کو "فلسفہ عجم" کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت کے متعلق خط لکھا گیا تھا اور خود اپنی تصنیف کے بارے میں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔

بہادر یار جنگ کے موسومہ خط کا فوٹو اس کتاب میں شامل ہے۔